جنگ آزادی کے
مسلم مشاہیر



جنگِ آزادی کے مسلم مشاہیر

محمد صدیق قریشی

۱۹۹۵ء

جملہ حقوق محفوظ ہیں

اہتمام

ڈاکٹر ظفر مقبول

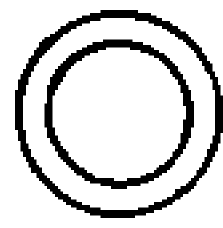
مقبول اکیڈمی

۱۹۹۔ سرکلر روڈ۔ چوک انارکلی لاہور

قیمت: ۱۵۰ روپے

مطبع: ٹی۔ کے۔ ایم پرنٹرز لاہور

فہرست



پیش لفظ

اگر دُنیا میں کوئی بغاوت حق بجانب کہی جا سکتی ہے تو وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بغاوت تھی۔ انسان کی سرشت میں قدرت نے وہ چنگاری دبا دی ہے جو اُسے حد درجہ ذلیل و خوار کرنے کی صورت میں ایک جہاں سوز آتش کا رُوپ دھار لیتی ہے۔ مسلمانوں نے ہندوستان میں صدیوں فرمانروائی کی، وُہ ذی وقار قوم تھے۔ سیاست اور حکمتِ عملی کے علم میں سب سے افضل تھے لیکن اُن کے اپنے تغافل کے سبب اقتدار نے اُن سے منہ موڑ لیا۔ فرنگیوں نے اُن کو زندگی کے ہر شعبے میں رسوا کرنے کی کوشش کی لیکن ابھی اُن میں حمیت ملّی کا دَور موجود تھا۔ شجاعت و بسالت کی لَو اُن کے دِلوں سے گُل نہ ہونے پائی تھی، اسلام کی دولت اُن کے پاس تھی۔ وُہ فقر میں بھی غنی تھے۔ ایمان کی اسی دولت نے اُن کے اندر وہ قوّت پیدا کر دی کہ وہ باطل کے ساتھ ٹکرانے کے لئے تیار ہو گئے۔ ابھی اُن کے اندر نظم و حکومت کا شعور بھی باقی تھا۔

مسلمانوں نے جہاد کی تحریک کی ابتداء بہت عرصہ قبل کر دی تھی، اگرچہ اس کے اظہار کی صورتیں مختلف تھیں۔ انہی میں سے ایک ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی بھی تھی مسلمانوں نے فرنگیوں کے ہاتھوں ستائے ہوئے ہنود کو بھی غیرت دلائی تو وہ بھی اُن کے ساتھ شامل ہو گئے۔ لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ یہ تحریک مسلم قائدین ہی کے ذہن اور فکر کی پیداوار تھی۔ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اپنی تباہی و بربادی پر جتنے مسلمان تڑپ رہے تھے اتنا احساس دوسروں کو نہ تھا۔ وہ اپنی عظمتِ پارینہ کو یاد کرتے

اور خداوند قدوس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو کر اس کی بحالی کے لئے دعاگو ہوتے۔

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی پر بے شمار قلمی کاوشیں کی گئی ہیں لیکن زیر نظر کتاب میں میں نے محض فرزندانِ توحید ہی کو موضوع سخن بنایا ہے۔ بادی النظر میں تحریک آزادی کا ہر مجاہد ایک شخص ہے لیکن مقصد کے عظیم تر حصول کے لئے ہر شخص شخصیت کے سانچے میں ڈھل کر ذات و صفات دونوں کا آئینہ دار نظر آتا ہے۔ تحریک کے مجاہدین کا احاطہ عددی اعتبار سے ناممکن ہے لیکن انسانی معاشرے میں شخصیات کی تعداد ہمیشہ ہی مختصر رہی ہے۔ ان مجاہدین نے آتشکروں کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں اور انقلاب کے نشتر سے ملت کے جسم کے ناسور کو ختم کرنے کی سعی کی۔ قدرت کی آن دیکھی مصلحتوں کو کون سمجھ سکتا ہے، تحریک ناکام ہو گئی لیکن اُن کا خون رائیگاں نہ گیا۔ انہوں نے ہمارے لئے ہماری منزل کا تعین کیا اور ٹھیک نوّے برس بعد اُن کے خون کی آبیاری سے ہمارے لئے ایک گلشن معرضِ وجود میں آیا جسے اب ہم نے اپنے خون سے سینچنا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ میں اس تحریک کے مجاہدین کے کارناموں کے ساتھ کہاں تک انصاف کر سکا ہوں۔ میں تو ان کی عظمت کو صرف سلام کر سکتا ہوں۔

چٹانیں پوچھتی ہیں۔

اِن نوجوانوں سے جن کی گولیاں
ہواؤں میں سرسراتی ہیں
جن کی کشادہ پیشانیوں کو
سورج ایسے چومتا ہے — جیسے
محبوبہ کے آنچل کی اڑانیں
فضاؤں کو بوسہ دیتی ہیں۔ یا
سورماؤں کی تلواروں کا نغمہ
کہساروں کی چوٹیوں پر ناچتا ہے (پشتو سے ترجمہ)

محمد صدیق قریشی
نیا محلہ روڈ جہلم
۸۹-۶-۲۶

پس منظر

تاریخ بتاتی ہے کہ برصغیر میں سب سے پہلے جو غیر ملکی داخل ہوئے۔ وہ ۲۰ مئی ۱۴۹۸ء کو پرتگیزی واسکوڈی گاما کی قیادت میں کالی کٹ پہنچے۔ ان کا بیڑا چار چھوٹے جہازوں پر مشتمل تھا اور ان کی رہنمائی ایک عرب جہازران احمد بن ماجد نجدی نے کی تھی۔

اس کے بعد ۱۶۰۱ء میں یورپ سے آنے والے تین انگریز تھے جو دربار اکبری میں حاضر ہوئے۔ ان کے قائد جان نیوبری نے ملکۂ انگلستان کا درج ذیل خط جلال الدین محمد اکبر کو پیش کیا:۔

"ملکۂ انگلستان کا پُرخلوص مکتوب شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر والیٔے ہندوستان کے نام ... میری رعایا کے پُرخلوص جذبات اس امر کے متقاضی ہیں کہ دنیا کے ہر خطۂ زمین پر بسنے والوں کے ساتھ ان کے تعلقات دوستانہ رہیں اور خیراندیشانہ جذبات کا مظاہرہ ہوتا رہے۔ جان نیوبری آپ کی مملکت کی حدود میں تجارت کا ارادہ رکھتے ہیں اسی لئے میں نے جان نیوبری کو خلوص، محبت، نیک نیتی اور دوستی کا پیغام دے کر آپ کی سلطنت میں بھیجا ہے، اس امید پر کہ آپ کی فیاضی، مہمان نوازی اور سخاوت ان کو ہر ممکن سہولت دے کر انگلستان کی محبت خرید لے گی۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ انگلستان میں بھی ہر خاص و عام کی زبان پر والیٔے ہندوستان کی فیاضی کے قصیدے ہیں۔ میں امید کرتی ہوں کہ ان تاجروں کو، جو میری رعایا ہیں، ہر قسم کی مدد ملے گی اور ملکہ انگلستان اور رعایا سے دوستانہ تعلقات رہیں گے۔"

چنانچہ اکبر نے ان فرنگی تاجروں کو مطلوبہ مراعات دے دیں۔ ۱۶۱۵ء میں

شہنشاہ جہانگیرؒ نے اپنے دربار میں سر ٹامس مور کو انگلستان کے سفیر کی حیثیت سے جگہ دی اور فرنگیوں کو مزید تجارتی مراعات دیں۔ اس طرح انہوں نے احمد آباد، سُورت اور بمبئی میں اپنے تجارتی مراکز اور چند کارخانے قائم کئے۔ ۱۶۶۸ء کے لگ بھگ ایل ڈچ نے تجارت کے ساتھ ساتھ زمینیں اور جاگیریں بھی خریدنی شروع کر دیں۔ رفتہ رفتہ فرنگیوں نے تجارت کے ساتھ ساتھ سیاسی اور انتظامی معاملات میں بھی مداخلت کرنا شروع کر دی۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ نے ان کے خلاف کارروائی کرنے کا حکم دیا۔ پٹنہ، قاسم بازار اور مچھلی ٹیم میں واقع ان کی کوٹھیاں چھین لیں اور بمبئی سے بھی ان کو نکال باہر کیا لیکن بحری قوت نہ ہونے کے سبب ان کا پوری طرح قلع قمع نہ کر سکا۔ اب فرنگیوں نے بحری قزاقی شروع کر دی۔ بحرِ ہند، خلیج فارس اور بحیرہ قلزم تو کیا سواحل ہند بھی ان کی دستبُرد سے محفوظ نہ رہے۔ ان کا خاص کر نشانہ حاجیوں کے جہاز ہوتے تھے۔ مجبوراً اورنگ زیب کو فرنگیوں کو دوبارہ تجارت کی اجازت دینی اور اُن کی کوٹھیوں کو بحال کرنا پڑا۔ بدقسمتی کہیئے کہ عالمگیر ایسے حکمران نے بھی اپنی بحری قوت میں اضافہ کرنے کی کوئی تدبیر نہ کی۔

فرخ سیر کے زمانے میں تو وہ اکثر مغل صوبیداروں کو محصول دینے سے انکار کر دیتے تھے۔ اسی زمانے میں فرخ سیر بیمار ہوا تو ایک فرنگی ڈاکٹر ہملٹن کے علاج سے شفایاب ہوا تو اُسے انعام دینا چاہا۔ اُس نے ذاتی نفع پر قومی منفعت کو ترجیح دی اور پورے ہندوستان میں بلا محصول تجارت کی مراعات حاصل کر لیں۔ اس طرح مغل سلطنت کی آمدنی گھٹ گئی اور فرنگی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ ۱۷۱۵ء میں انہوں نے کلکتہ میں فورٹ ولیم نامی ایک عالی شان قلعہ تعمیر کیا اور پھر انگلستان سے مختصر گورے پلٹن بھی طلب کر کے تعینات کر لی جس میں رفتہ رفتہ اضافہ کرتے گئے اور دوسری طرف زمینداری بھی بڑھاتے گئے۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملے نے مغلیہ سلطنت کے ضعف میں اور اضافہ کیا جس سے اندرونی قوتوں (سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں) نے کھلم کھلا دہلی پر حملے شروع کر دیئے۔ ان حالات سے فرنگیوں نے بھی فائدہ اُٹھایا

اور اپنی استحکامات میں اضافے کا سلسلہ جاری رکھا۔ نواب علی وردی خان حاکم بنگال فرنگیوں کے عزائم سے واقف ہو چکے تھے۔ اُن کی وفات کے بعد مرزا محمد، جو نواب سراج الدولہ کے نام سے جانے جاتے ہیں، نے اُن کی دست درازیوں کو روکنا چاہا۔ فرنگیوں نے بھی انہیں اپنے مقاصد کی راہ میں سنگِ گراں سمجھا جس کا نتیجہ ۱۷۵۷ء کی پلاسی کی لڑائی کی شکل میں نکلا جس میں نواب موصوف میر جعفر ایسے وطن فروشوں کی غداریوں کی وجہ سے شہید ہوئے۔ پلاسی کی لڑائی ہندوستان کی آزادی و غلامی کے فیصلہ کا سب سے اہم معرکہ اور فتح و شکست کا پہلا موڑ تھا۔ اب فرنگیوں کے قدم اس ملک میں پوری طرح جم گئے۔

۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی کے حملے نے جہاں مرہٹوں کی طاقت پر ضرب کاری لگائی وہاں مغلیہ اقتدار کو بھی بالواسطہ نقصان پہنچا، اگرچہ اس حملے کا مقصد مغل سلطنت کو تقویت پہنچانا تھا۔ ۱۷۶۴ء میں بکسر کی لڑائی ہوئی۔ اس میں شاہ عالم کی فوجیں بھی میر قاسم کی حمایت میں شریک ہوئیں لیکن انہیں شکست ہوئی۔ نتیجۃً دہلی کی مرکزی حکومت بھی سیاسی طور پر فرنگیوں کے آگے سرنگوں ہو گئی۔ ۱۷۶۵ء میں کڑا اور الہ آباد کے صوبوں کی دیوانی فرنگی ٹھیکیداروں کو دیدی گئی، مالگذاری چھبیس لاکھ روپے سالانہ مقرر ہوئی۔ یہ معاملہ اتنی سرعت سے طے پایا کہ طباطبائی لکھتے ہیں: "کسی بوجھ لادنے والے گدھے اور کسی چوپائے کی خریداری بھی اتنی جلدی بغیر کسی ردّ و کد کے طے نہیں پاتی لیکن یہاں (اتنا بڑا معاملہ) طے پا کر ختم ہو گیا۔" ۱۷۷۱ء میں مرہٹوں نے نابینا شاہ عالم کو اپنا وظیفہ خوار بننے پر مجبور کر دیا، اس طرح جس سلطنت کا پھیلاؤ کشمیر سے دکن تک اور بنگال سے کابل اور قندھار تک دیکھنے میں آتا تھا وہ محدود ہو کر دلی کے لال قلعہ کی چار دیواری میں باقی رہ گئی۔ دوسری طرف مختلف علاقوں میں مختلف نوابوں اور راجوں نے اپنی اپنی عملداری قائم کر لی۔

دریں اثنا فرنگی اپنی قوت کو بدستور بڑھا رہے تھے۔ جنوبی ہندوستان میں میسور کے حیدر علی نے اُن کے بڑھتے ہوئے طوفان کو محسوس کیا۔ دسمبر ۱۷۸۲ء میں انہوں نے

اس وقت انتقال کیا جب ارکاٹ کے قریب فرنگیوں کو شکست ہونے والی تھی۔
اُن کے فرزند سلطان فتح علی عرف ٹیپو نے جہاد جاری رکھا اور بید نور و منگلور کے مقامات پر ۱۷۸۴ء میں فرنگیوں کو لوہے کے چنے چبوائے۔ بعد میں معاہدہ منگلور کے نام سے فریقین میں صُلح ہوگئی۔

سلطان فتح علی بحری طاقت کی اہمیّت کو جانتے تھے۔ اس لئے آپ نے یہ محسوس کیا کہ فرنگیوں کے وجود نامسعود سے ہندوستان کو پاک کرنے کے لئے ان کو صرف خُشکی میں شکست دینا کافی نہیں بلکہ ان کی بحری طاقت کو توڑنا اور ان کے سمندری راستہ پر قبضہ کرنا ضروری ہے۔ اسی ضرورت کے تحت سلطان نے سلطان ترکی اور حکمران مسقط کے علاوہ نپولین سے بھی امداد چاہی تھی۔ صلح نامہ منگلور زیادہ دیر باقی نہ رہ سکا کیونکہ فرنگیوں نے نظام اور مرہٹوں کو سلطان فتح علی کے خلاف بھڑکا کر لڑائی شروع کرا دی جو تقریباً چار برس جاری رہی، بعد میں وُہ خود بھی لڑائی میں شامل ہو گئے۔ یہاں بھی اپنوں کی غدّاری کے باعث سلطان ٹیپو کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۷۹۹ء میں سلطان فتح خاں نے جام شہادت نوش کیا۔ میسور کی فتح سے فرنگیوں نے گویا کُل ہندوستان فتح کر لیا۔

اب فرنگیوں نے دہلی کے قلعہ مُعلّٰی کی طرف دوبارہ توجّہ کی۔ ۱۱ستمبر ۱۸۰۳ء کو جنرل لارڈ لیک چار ہزار کے لشکر کے ساتھ جمنا کے مشرقی کنارے صف آرا ہُوا۔ اگرچہ مرہٹوں نے پندرہ ہزار فوج کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن انہیں پسپا ہونا پڑا۔ ۱۴ستمبر کو فرنگی فوج دہلی داخل ہوئی۔ شاہ عالم نے جنرل لیک کو فتح کی مبارکباد دی اور بڑے بڑے سلبے خطابات "صمصام الدولہ اشجع الملک خانِ دوران جنرل لیک بہادر فتح جنگ" اور خلعت فاخرہ سے سرفراز کیا!

ایسٹ انڈیا کمپنی کا کرنل اکٹرلونی، جو پہلے کمپنی کا ڈپٹی ایڈجوٹنٹ تھا، دہلی کا ریذیڈنٹ مقرر ہُوا۔ اس طرح شاہ عالم عملاً لال قلعہ میں گوشہ نشین ہو کر رہ گیا، دِلّی والے مذاقاً

لے واقعاتِ دارالحکومت دہلی، حصہ اوّل، بشیرالدین احمد، ص ۶۸۴۔

کہا کرتے تھے : بادشاہی شاہ عالم از دلی تا پالم " فرنگیوں کی قسمت نے یاوری کی اور دہلی کی شکست کے بعد مرہٹوں نے دوآبہ کا کُل علاقہ اور آگرہ اُن کے حوالے کر دیا۔ ۱۸۰۶ء میں اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی کے بعد دہلی بھی اس کے ہاتھوں سے نکل گئی اور صرف لال قلعہ پر اُس کا قبضہ باقی رہ گیا۔ ہر طرف یاس و نا اُمیدی تھی۔ جیسے ہی حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اُمید کی کرن بن کر نمودار ہوئے۔ اس جواں ہمت ساٹھ سالہ پیر ناتواں نے قوم کو جھنجھوڑا اور ہندوستان کو دارالحرب قرار دیتے ہوئے فرنگیوں کو قطاع الطریق اور سراق قرار دیا۔ یہ فتویٰ آزادی کا پہلا منشور تھا :

" دریں شہر حکم امام المسلمین اصلا جاری نیست و حکم رؤسا نصاریٰ بے دغدغہ جاری است و مراد از اجرائے احکام کفر ایں است کہ در مقدمہ ملک داری و بندوبستِ رعایا واخذ خراج و عشور اموال تجارت وسیاست قطاع الطریق وسراق وفصل خصومات وسزائے جنایات کفار بطور خود حاکم باشند " [1]

اس دلیرانہ پاداش میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ پر صعوبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ مرکزی حکومت کی کمزوری، صوبہ داروں کی خود مختاری اور اُمراء کی حرص وُہ عناصرِ ثلاثہ تھے جنہوں نے کوئی متحدہ پلیٹ فارم قائم نہ ہونے دیا۔ اس کے علاوہ فرنگیوں نے محکوم طبقوں کے مذہبی اختلافات کو ہوا دینے کے ساتھ ساتھ پنجاب میں سکھوں کو اُبھارا کہ وُہ مسلمانوں کی زندگی اجیرن کریں۔ مجبوراً حضرت شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ اسمٰعیل اور سید احمد بریلوی نے عام مسلمانوں کی بھاری جمعیت کے ساتھ صوبہ سرحد کی طرف خروج کیا۔ مقصد یہ تھا کہ ان علاقوں سے سکھوں کی چیرہ دستیوں کا خاتمہ کرنے کے بعد یہاں کے جنگجو اور بہادر مسلمانوں کی ایک صالح اور عوامی حکومت قائم کی جائے جو فرنگیوں سے دو دو ہاتھ کرے۔ مگر افسوس یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو یہ دونوں سرفروش اپنوں کی غداری کا شکار ہو گئے۔

---

[1] فتاویٰ عزیزیہ، جلد اوّل

اس تحریک جہاد کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کو یاس و نا اُمیدی نے گھیر لیا۔ اگرچہ محدود سطح پر سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کے پیرو کاروں نے اصلاحی سرگرمیاں جاری رکھیں لیکن جن عظیم مقاصد کے لئے یہ تحریک شروع کی گئی تھی وہ حاصل نہ ہو سکے۔ ایسی توقع ہرگز نہ تھی کہ مسلمان اتنی جلدی شکست کے ساتھ سمجھوتہ کر لیں گے ایک عظیم سلطنت کے مالکوں کو اس کے احیاء کی کوئی بھی اُمید نہ رہی تھی۔ جو لوگ صاحبِ ہمت تھے۔ وُہ اُمید کا دامن چھوڑ چکے تھے۔ وُہ یا تو مایوس تھے یا اُن خطرات سے بے خبر تھے جو اُن کو پیش آنے والے تھے۔ اُن کی اُمیدوں اور جذبات میں عوام النّاس نے شرکت کی۔ ایک اوسط درجہ مسلمان کو اب بھی یہ اُمید تھی کہ وُہ اپنی حکومت کو خود قائم ہوتے ہوئے دیکھے گا۔ اودھ کے اکثر اضلاع اور روہیل کھنڈ اور دہلی میں اس انقلابی تحریک کی چنگاریاں موجود تھیں۔ بے شمار مجاہدین در پردہ علمی وسیاسی تعلیم کے ساتھ شمشیر و تفنگ کی تربیت میں بھی مصرُوف تھے۔

آیئے اب دہلی کے واقعات پر نظر ڈالتے ہیں۔ دہلی میں ابتری تھی۔ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا گورنر جنرل سر چارج بارلو تھا۔ پہلے سکوں پر فرمانروائے دہلی کا نام نقش ہوتا تھا، ۱۸۳۵ء سے یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔ گورنر جنرل کی مُہر سے "فدوی خاص بادشاہ" کے الفاظ بھی محو کر دیئے گئے۔ روسا کو ہدایت کی گئی کہ وُہ بھی اپنی اپنی مُہروں سے یہ بے معنی الفاظ حذف کر دیں۔ ۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ ثانی کی وفات پر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے۔ شروع شروع میں یہ کیفیت تھی کہ گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف بادشاہ کی خدمت میں نذریں گزارتے۔ فرنگی ریذیڈنٹ مکاتیب میں اپنے آپ کو بادشاہ کا "فرزند" لکھتا تھا اور اِسے اپنے لئے ایک اعزاز سمجھتا۔ پھر ۱۸۴۳ء میں لارڈ ایلنبرا نے نذر گزارنی بند کر دی۔ اعزازات و القاب نظر انداز کئے جانے لگے بادشاہ کے رقعوں کو ردی کی ٹوکری میں پھینکا جانے لگا۔ فرنگیوں نے لاہوری دروازے پر بہادر شاہ کی ایک تصویر بنائی تھی جس کے گلے میں پھانسی ڈال دی گئی تھی۔ غرض بادشاہ کی تذلیل کی کوئی حد باقی نہ تھی۔ ایک سرکاری افسر نے بادشاہ کی تعظیم کے لئے اپنے سر

پر سے ٹوپی اتاری تو اس پر انگریزی اخبارات نے لعن طعن کا تار باندھ دیا تھا[۱]

حقیقت یہ ہے کہ فرنگی کئی بار بہادر شاہ ظفر کی برائے نام بادشاہت کو ختم کرنے کے منصوبے بھی بنا چکے تھے صرف وہ عوامی ردِ عمل سے خائف تھے۔ انہوں نے درپردہ حکمت عملی کی چالیں روا رکھیں اور اصلاحات کے نام پر مغربی تہذیب و معاشرت پھیلانے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ ۱۳ جنوری ۱۸۴۹ء کو شمالی مغربی صوبجات کے کثیر الاشاعت اخبار دہلی گزٹ نے یوں لکھا: "جمعرات کی صبح کو ولی عہد سلطنت شہزادہ دارا بخت کا انتقال ہو گیا اور اُن کے بعد شہزادہ فخرالدین ولی عہد قرار پائیں گے۔ ہمارے پاس اس امر کے یقین کرنے کے وجوہ ہیں کہ شاہی خاندان کا حق جانشینی اس کے بعد ختم ہو جائے گا۔ اس لئے کہ انفرادی طور پر ان سے اس کی ذمہ داری کرلی گئی ہے اور ایسی ذمہ داری اور کسی فرد خاندان سے نہیں کی گئی۔ ہم صدقِ دل سے اعتماد کرتے ہیں کہ صورتِ حالات درحقیقت ایسی ہی ہے اور یہ کہ ہماری حکومت بادشاہ کے انتقال پر خاندان کو منتشر کرنے کا معقول انتظام کرے گی اور گزارے کے لئے مناسب پنشن کا بندوبست کرے گی"۔[۲]

بساط بچھائی جا چکی تھی لیکن آئندہ کے واقعات پر نظر ڈالنے سے قبل وہ کردار دیکھنا ضروری ہے جو عیسائیت نے ہندوستان میں ادا کیا۔

برصغیر میں پادریوں کی آمد کلائیو اور ہیٹنگز ہی کے زمانے سے شروع ہو گئی تھی۔ مدارس اور بنگال میں فرنگی تسلط کے بعد آمد کا یہ سلسلہ اور بھی بڑھ گیا۔ فرنگیوں نے بحیثیت حکمران غیر عیسائی رعایا کے متعلق اپنے فرائض سے آنکھیں موندلیں حکومت کی پشت پناہی سے عیسائی پادریوں نے اپنا کام زیادہ زور و شور سے جاری رکھا۔ ریورنڈ کینیڈی نے اُس وقت لکھا: "جب تک ہندوستان میں ہماری سلطنت

---

[۱] - تاریخ عروج عہد انگلشیہ، ذکاءاللہ، ص ۲۳،

[۲] بحوالہ غدر کی صبح و شام ص ۲۸

قائم رہتی ہے، چاہے ہم پر کچھ بھی مصائب آئیں، اُس وقت تک ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس میں عیسائیت کی تبلیغ ہمارا فرض اولین ہے۔ جب تک کہ کیپ کمورن سے ہمالیہ تک ہندوستان مسیحؑ کا مذہب قبول نہ کر لے اور جب تک کہ یہ ہندو اور مُسلم مذاہب کو ناکارہ نہیں کرتا اُس وقت تک ہماری کوششیں استقلال سے جاری رہنی چاہئیں۔ اس کام کے لئے ہمیں تمام وہ کوششیں کرنی چاہئیں جو ہم کر سکتے ہیں اور تمام قوّت اور اتھارٹی استعمال کرنی چاہیئے جو ہمارے قبضۂ قدرت میں ہے مسلسل اور ناختم ہونے والی کوششیں اُس وقت تک جاری رکھنی چاہئیں جب تک ہندوستان ایک عظیم قوم نہیں بن جاتا ـــــ مشرق میں عیسائیت کا قلعہ۔"[1]

چنانچہ مختلف طریقوں سے عیسائیت کی تبلیغ میں سرگرمی پیدا کر دی گئی۔ اسکولوں، ہسپتالوں اور محتاج خانوں وغیرہ میں کم استطاعت لوگوں کو عیسائی بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ پادریوں کے علاوہ ضلع کے انگریز حاکم بھی دیہاتوں میں اس کام میں سرگرم عمل نظر آتے۔ پادریوں کو عام اجازت تھی کہ وہ جیل خانوں میں جائیں اور قیدیوں کو انجیل کا درس دیں۔ پادری گوپی ناتھ نندی نے بے شمار ہندوستانیوں کو عیسائی بنایا۔ اس ضمن میں ہندوستانیوں کی غربت نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا۔ ۱۸۳۷ء کے عظیم قحط میں یتیموں کو عیسائی مبلغین کی تحویل میں دے دیا گیا کہ وہ اُن کو بپتسمہ کریں۔ تعلیمی ڈھانچہ بھی تبدیل کر دیا گیا۔ کالجوں میں فقہ، حدیث اور ہندو شاستروں کی جگہ انجیل کے مختلف حصّے شامل ہونے لگے میکالے نے ۱۲ / اکتوبر ۱۸۳۶ء کو ایک خط میں اپنی والدہ کو لکھا! "یہ میرا مضبوط ایمان ہے کہ اگر ہمارے تعلیمی منصوبے پر عمل کیا گیا تو تیس برس بعد بنگال میں ایک بھی بُت پرست نہیں رہے گا۔"[2]

۱۸۵۰ء کے ایک ضابطہ ۲۱ کی رُو سے برقرار پایا کہ جو ہندوستانی مذہب تبدیل کرے وہ اپنے اجداد کی جائیداد کا پھر بھی وارث ہو سکتا ہے۔ اس سے مداخلت فی الدین کا گمان مستحکم ہو گیا۔ پادری گوپی ناتھ نے اس ضابطہ کے بعد چوبیس افراد کو عیسائی

---

[1] ساورکر ص ۷۴ [2] تھامپسن اور گیرٹ ص ۳۱۹

بنایا جن میں سے دس مسلمان تھے۔ گرجاگھروں کی تعمیر سرکاری خرچ سے ہونے لگی۔ ۱۸۵۵ء کے اواخر میں پادری ایڈمنڈ نے کلکتہ سے ایک مُراسلہ جاری کیا جسے تعلیم یافتہ خاص کر سرکاری حکام کے پاس بھیجا گیا۔ اس میں مذکور تھا! "ہندوستان میں ایک عملداری ہے۔ تار برقی اور ریلوے لائن کے ذریعے سب جگہوں کو ایک کر دیا گیا ہے۔ مذہب بھی ایک ہی ہونا چاہیئے اس لئے آپ لوگوں کو مسیحیت کا ایک دین اختیار کر لینا چاہیئے" جب اس پر شدید ردّ عمل ہوا تو حکومت نے اسے پادری ایڈمنڈ کے ذاتی خیالات قرار دیا اور وضاحت کی کہ حکومت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

۱۸۴۵ء میں جیل خانوں میں اصلاحات کی آڑ میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ پہلے ہندو قیدی اپنے لئے خود کھانا تیار کرتے تھے، اب ہر جیل میں ایک ایک برہمن باورچی مقرر کر دیا گیا جو بلا امتیاز تمام ہندوؤں کا کھانا ایک ہی جگہ پکاتا اور ان سب قیدیوں کو اکٹھے کھانا کھانا پڑتا۔ اِسے ہندوؤں کی مختلف ذاتوں نے اپنی ذاتوں اور مذہب میں مداخلت خیال کیا۔ پھر یہ مشہور ہو گیا کہ فوجی چھاونیوں میں بھی ہندو سپاہیوں کو اسی طرح کھانا ملتا ہے ۱۸۴۵ء اور ۱۸۴۶ء میں ان تبدیلیوں کے خلاف پٹنہ میں بغاوت بھی ہوئی۔

پھر فرنگی حُکام نے مستورات کے پردہ کی رسم ختم کرنے کی کوشش کی۔ ۵۰-۱۸۴۹ء کے دوران میں مختلف اضلاع خاص کر شاہ جہان پور میں ضلعی حُکام اور محکمۂ صحت نے باضابطہ اعلان کیا کہ وہاں کے ہسپتالوں میں پردہ نشین اور کم استطاعت کی خواتین داخل نہیں ہو سکیں گی۔ ۱۸۵۶ء کے آخر میں لارڈ کیننگ نے ہندوؤں کی بیواؤں کی دوبارہ شادی کا قانون منظور کیا جسے اعلیٰ ذاتوں کے ہندوؤں نے سخت ناپسند کیا۔ اس سے پہلے ۱۸۳۰ء میں لارڈ ہیسٹنگ نے ستی کی رسم کو بند کرایا تھا لیکن بعد میں اس حکم کو واپس لے لیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اس کے جانشین لارڈ ولیم بنٹنگ نے پھر یہ قانون نافذ کیا۔ اِسے بھی ہندوؤں نے اپنے مذہب میں مداخلت خیال کیا۔

اب فوجی "اصلاحات" کی ایک اجمالی تصویر دیکھیئے۔ اکبر شاہ ثانی کے عہد کے کمپنی کے گورنر جنرل سر جارج بارلو نے حکم دیا کہ مدارس کی افواج کے سپاہیوں کو داڑھیوں،

مونچھوں کو ترشوا کر فرنگیوں کے مشابہ کر دیا جائے اور پگڑی میں چمڑے کا ایک فیتہ لگا دیا جائے۔ ہندوؤں نے اسے گائے اور مسلمانوں نے سور کا چمڑا خیال کیا۔ افواج میں فرنگیوں اور دیسی سپاہیوں کے تناسب سے پتہ چلتا ہے کہ کل افواج میں ۳۱۵،۵۲۰ افراد شامل تھے جن کے مصارف کا اندازہ ۹،۸۰۲،۲۳۵ پونڈ سالانہ تھا۔ ان میں ۵۱،۳۱۶ پونڈ فرنگی افسروں اور سپاہیوں کی تنخواہوں پر کل مصارف میں ۵،۶۶۸،۱۱۰ پونڈ سالانہ خرچ ہوتا تھا۔ باقی سپاہ کثیر ہندوستانیوں پر مشتمل تھی جن کی کل تعداد ۲۶۴،۲۱۶ تھی اور ان پر محض ۱۲۵-۴،۱۳۴ پونڈ سالانہ خرچ کیے جاتے۔

اس امتیازی سلوک کی باقی تفصیل ۱۸۵۷ء میں ایک سوار رسالہ متعینہ بریلی کے ایک کلرک کی زبانی سنیئے:

"ہندوستانی سپاہی کو اپنی وردی کی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی۔ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو جب اسے تنخواہ ملتی تو وردی کی رقم اور راشن کے سلسلے میں چھاؤنی بازار کے بنیے کا قرض ادا کرنے کے بعد عموماً اس کے پاس ایک روپے، ڈیڑھ روپے سے زائد باقی نہ رہتا۔ اس کی خوراک صرف دال روٹی تھی۔ اس کی تنخواہ سات سے نو روپیہ ماہانہ تک تھی جس کے عوض اسے سخت سے سخت مشقت اور جانبازی کے فرائض انجام دینے پڑتے۔ یہ تو پیدل پلٹن کے سپاہی کا حال تھا۔ سوار سپاہی کو اکیس سے تیس روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی۔ اس میں اسے گھوڑا بھی خریدنا ہوتا اور بہت سی منہائی اور کٹوتی بھی ہوتی۔ اس کے مقابلے میں آرام و آسائش کی زندگی گزارنے والے انگریز سپاہیوں کو بے اندازہ مراعات اور مشاہرہ ملتا۔ یہ حالات دیکھ کر اور سمجھ کر دیسی افواج میں بغاوت کے جذبات پیدا ہونا بقینی تھے"

ابتدا میں فرنگیوں کی طرف سے دیسی سپاہیوں کو اگرچہ تنخواہ بہت کم ملتی تھی مگر انہیں ڈاک پر ٹکٹ لگانے اور ذاتی سامان پر چونگی ادا نہ کرنے جیسی معمولی مراعات حاصل تھیں معمولی خطائیں نظر انداز کر دی جاتی تھیں بعد میں ڈسپلن کے نام پر پابندیاں بڑھا دی گئیں۔ دیسی سپاہیوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا جاتا۔ چھپرہ (بہار) میں دیسی سپاہیوں

نے کم تنخواہ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ہڑتال کی۔ فرنگی عدالت نے اس کی پاداش میں ۲۴ دیسی سپاہیوں کو توپ دم کرنے کی سزا دی۔ چار سپاہیوں کو توپ دم کرنے سے قبل چار اور جوان آگے بڑھے کہ یہ سعادت اُن کو پہلے ملنی چاہیئے۔ فرنگی افسر کو طیش آگیا۔ چاروں اسیر کھول دیئے گئے اور آگے بڑھنے والے جوانوں کو پہلے توپ دم کیا گیا۔ مگر اس خیال سے کہ کہیں دیسی فوج بپھر نہ جائے ان سے ہتھیار رکھوا لئے گئے اور گورا فوج کو حکم ملا کہ توپوں کے دہانے ان کی طرف موڑ دیئے جائیں تاکہ پیش قدمی پر ان پر آتشباری کر دی جائے۔ ۱۸۲۴ء میں بارک پور چھاؤنی میں سپاہیوں نے اپنی جیب سے باربرداری کے اخراجات دینے سے (برما کی لڑائی میں شرکت کے لئے) انکار کر دیا تو کمانڈر ایڈورڈ ڈو پیجپٹ کے حکم سے بے شمار دیسی سپاہیوں کو توپوں کے گولے برسا کر مار ڈالا گیا۔ کچھ نے دریا میں کُود کر جان دے دی۔ مظالم ڈھاتے وقت دیسی سپاہیوں کی قربانیوں کو بھی پیش نظر نہ رکھا گیا۔ ارکاٹ (جنوبی ہند) کے محاصرے کے موقع پر سپاہیوں نے چاول کا اُبلا ہُوا پانی (پیچ) پی کر کئی کئی دن کاٹے تھے جبکہ فرنگی چاول کھاتے تھے۔

فرنگیوں نے کسانوں کو تہ تیغ کرنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ زمینداری کے نظام کا خاتمہ کر دیا گیا۔ پرائز کمیشن کی رو سے یہ لازم قرار پایا کہ تمام زمیندار اور جاگیر دار حکومت کو اپنی جاگیروں کی باضابطہ اسناد دکھائیں۔ چونکہ تحریری اسناد اور شہادتیں موجود نہ تھیں لہٰذا پانچ برس کے اندر اس قانون کے ذریعہ ۳۵ ہزار جاگیروں کی سندیں طلب کر کے ان میں اکثر بمبئی کے علاقے میں ضبط کر لی گئیں۔ فرنگیوں نے عوام کو قرضوں میں جکڑ کر پھر ان کو قرضداری کے خلاف ڈگری دے کر سخت سزائیں دیں۔ اس طرح بلا تحقیق و ثبوت لوگوں کو زمینیں اور جاگیریں نیلام ہو جایا کرتیں۔ دوسری طرف ہندوستانی دستکاریوں کو ختم کر دیا گیا۔ ان کاریگروں کو انگوٹھے اور ہاتھ کاٹ کر معذور بنا دیا گیا جن کے بنائے ہوئے نفیس سازوسامان اور کپڑوں کو دنیا میں سوغات کے طور پر پیش کیا جاتا تھا اور جنہیں استعمال کرنا فخر و مباہات کا باعث تھا۔ اس کا مقصد محض بدیسی مصنوعات کو فروغ دینا اور یہاں کی دولت کو لوٹنا تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کی گئی ایک رپورٹ میں یہ تسلیم کیا گیا

کہ کمپنی کا انتظام محض ایک ہی مقصد کے لئے تھا یعنی اس ملک سے اس ملک میں دولت کی ترسیل[۱]

فرنگیوں سے قبل تمام مذاہب والے اپنی اپنی عبادت گاہوں کے انتظامات اور دیکھ بھال خود کیا کرتے تھے۔ کمپنی نے ہندوؤں کے تمام مندروں کے انتظامات اپنی نگرانی میں لے لئے حتیٰ کہ جگناتھ پوری کے مشہور مندر پر فرنگی حکومت کا قبضہ ہوگیا۔ احتجاج کا ایک سلسلہ چل نکلا اور آخر کار قدیم انتظامات بحال کر دیئے گئے۔

جو رئیس اور حکمران انگریزوں کی دوستی کے جادو سے مسحور ہوئے، ان کے لئے یہ دوستی انجام کار مہلک ثابت ہوئی۔ ان میں سے ہر ایک کو مسند اقتدار چھوڑنی پڑی یا وہ اس عفریت کے ہاتھ میں بے جان کھلونے بن کر رہ گئے جو اپنی مرضی پوری کرانے پر تلی بیٹھی تھی ان حکمرانوں نے دوستی کی راہ اختیار کی یا دشمنی کی، نتیجہ دونوں حالتوں میں ایک ہی نکلا۔ اگر انہوں نے غاصب فرنگیوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار نہ کئے تو ان پر ارادہ بد کا الزام لگا کر حملہ کر دیا گیا اور ان کے علاقے مسخر کر لئے گئے۔ اگر انہوں نے پیش کردہ دوستی قبول کر لی تو وہ ڈپلومیسی کے جال میں اس طرح الجھ گئے کہ اپنی عزت اور موروثی علاقوں سے محروم ہوئے بغیر نجات نہ پا سکے۔ حق یہ ہے کہ وہ لوگ جہاں حکومت کرتے رہے تھے، وہیں قیدی بن کر رہ گئے۔

لارڈ ڈلہوزی (۱۸۴۸ء۔ ۱۸۵۶ء) کے دور حکومت میں اس کی عہد شکنیوں اور دل آزاریوں کی انتہا ہوگئی۔ الحاق کا نظریہ پیش کیا گیا جو مختصراً یہ تھا کہ جن حکمرانوں کی امداد سے کمپنی کی حکومت قائم ہوئی اور جن سے سالہا سال سے عہد نامے چلے آرہے تھے وہ لاولد مر جائیں تو ان کی سلطنتوں کو فرنگی اپنے تصرف میں لے آئیں۔ ہندوؤں کے ہاں متبنیٰ بنانے کی رسم صدیوں سے چلی آرہی تھی۔ ڈلہوزی نے تمام روایات اور

ANNUAL REGISTER 1784-85, P.64

CIVIL DISTURBANCES DURING THE BRITISH RULE P.8

FOOTNOTE.

عہدناموں کو پس پشت ڈال کر الحاق کی سکیم کا نفاذ کرایا۔ اس کا مقصد خود اس کے اپنے الفاظ میں یہ تھا:

"حکومت انگریزی کا فرض ہے کہ ہر ایسے جائز موقع سے فائدہ اٹھائے جس سے اس کی مملکت یا دولت میں اضافہ ہوتا ہو۔"

اس طرح درج ذیل ریاستوں کا الحاق فرنگیوں نے اپنے ساتھ کیا:

۱۸۲۶ء میں بھرت پور — یہ دلی کے قریب جاٹوں کی ریاست تھی۔

۹ اپریل ۱۸۴۷ء کو رُدیر

۲۶ دسمبر ۱۸۴۵ء کو بہاول پور

۱۸۴۸ء میں جیت پور

۱۸۴۹ء میں سکم، ستارا، پنجاب، سنبھل پور

۱۸۵۲ء میں ڈونگر پور

۱۸۵۳ء میں جھانسی، کرناٹک، ناگ پور

۷ فروری ۱۸۵۶ء کو اودھ پر قبضہ کر کے کئی خاندانوں کو اُن کی ملکیت سے محروم کر دیا گیا۔ قبضہ کے وقت تعلقہ داروں کی جاگیروں میں ۲۳۵۰۵ دیہات تھے۔ ان میں سے ۱۳۰۶۴ دیہات ۳۵،۰۶،۵۱۹ روپے لگان ادا کرتے تھے۔ ان کو ان کی ملکیت ہی میں رہنے دیا گیا۔ ۱۱،۹۰۳ دیہات جو ۳۲،۰۸،۳۱۹ روپے لگان دیتے تھے انہیں دوسروں کی تحویل میں دے دیا گیا۔ کچھ تعلقہ داروں نے سب کچھ ہی کھو دیا۔ اودھ جیسی وفادار ریاست کے الحاق کے بعد والیانِ ریاست کو یقین ہو گیا کہ اب فرنگیوں کی دستبرد سے نہ تو انکو اُن کی وفاداری بچا سکتی ہے اور نہ روپیہ ہی اُن کا منہ بند کر سکتا ہے۔ غرض اودھ کے الحاق نے ہندوستان کو بے چینی، اور بے اطمینانی اور اضطراب کا آتشکدہ بنا کر رکھ دیا۔ ان زیادتیوں کے علاوہ ڈلہوزی نے

(۱) پیشوا باجی راؤ ثانی کی وفات پر اس کے متبنٰی نانا راؤ کو اس کی آٹھ لاکھ روپے کی پنشن سے محروم کر دیا۔

(۲) نواب کرناٹک کا انتقال ۱۸۵۳ء میں ہُوا۔ اگرچہ اس کے جانشین موجود تھے مگر ڈلہوزی نے عہد ناموں کو نظر انداز کر کے اس کے خطابات اور وظائف ضبط کر لیئے یہی حشر تنجور کا ہُوا۔

(۳) یہ بھی فیصلہ کر دیا گیا کہ مغل شہنشاہ کی وفات پر اس کی اولاد کو جملہ اختیارات، خطابات، شاہانہ اور قلعہ کے قیام سے محروم کر دیا جائے گا۔

مختصر یہ کہ ان اقدامات کے خلاف ۱۷۵۷ء - ۱۸۵۷ء کے درمیانی عرصے میں ہندوستان میں سول یا فوجی بغاوتیں ہوتی رہیں۔ ان کے اسباب سال چھ ماہ کی پیداوار نہ تھے بلکہ اس ایک صدی میں بتدریج مہیا ہوتے رہے۔ میر قاسم کی بغاوت پہلا کھُلا ردِعمل تھا جو کمپنی کے جابرانہ راج کے خلاف ہوا، چاہے اس کا مقصد بنگال سے فرنگیوں کو نکالنا تھا یا نہیں۔ ۱۷۶۴ء میں فوج نے بنگال کے میر جعفر کی لوٹ کھسوٹ میں سے اپنا حصہ لینے کے لیئے شورش کی اور اسے لے کر چھوڑا۔ یہ بنگال کی آرمی کی پہلی شورش تھی۔ اس میں پانچ بٹالین شامل تھیں۔ اس شورش کے سات ماہ بعد بنگال آرمی کی دوسری شورش ہوئی۔ یہ بغاوت سب سے پُرانے بٹالین نے کی۔ فرنگیوں نے اس کے دیسی قائدین کو سب کے سامنے توپ سے اڑا دیا۔ ۱۷۶۹ء میں دھلبھم کے راجاؤں کی بغاوت ہوئی جو پانچ سال تک جاری رہی۔ ۱۷۸۳ء میں ایک بغاوت رنگ پور اور ۱۷۸۹ء میں دوسری بغاوت بشنون پور میں ہوئی۔ ۱۷۹۰ء میں وزیگاپٹم اور ۱۷۹۴ء میں وزیرام راؤنری کی بغاوتیں ہوئیں جو جنوبی ہندوستان میں برپا ہوئیں۔ ۱۷۹۶ء میں پایچے راجا نے بھی جنوبی ہندوستان ہی میں علَم بغاوت بلند کیا۔ یہ اِتنی شدید تھی کہ ۱۸۰۵ء تک جاری رہی۔ ۱۷۹۹ء میں تین بغاوتیں بنگال اور شمالی ہندوستان میں ہوئیں، یہ چوارس اور وزیر علی کی شورشیں تھیں اور سلہٹ کے ہنگامے ان کے علاوہ تھے۔ جنوبی ہندوستان میں بدنور میں ڈھُندیا کی بغاوت دو سال تک جاری رہی۔ ۱۸۰۰ء میں گنجام میں جدوجہد ہوئی جو پانچ برس تک جاری رہی۔ ۱۸۰۱ء میں ٹنی ویلی میں پولی گرز کی جدوجہد ہوئی۔ جنوبی ہندوستان کی اس بغاوت کو فرو کرنے میں چار سال لگے۔ پھر ۱۸۰۳ء میں شمالی ارکاٹ کی جدوجہد

شروع ہوئی جو ۱۸۰۵ء تک جاری رہی۔ ۱۸۰۶ء میں مدارس کی چھاؤنی میں ویلور کی بغاوت ہوئی۔ فرنگی کمانڈر نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ داڑھی مونچھیں صاف کریں، پگڑی میں چمڑے کا استعمال کریں تاکہ وُہ انگریزی ہیٹ کی مثل نظر آئے۔ ہندوؤں کو ماتھے پر تلک نہ لگانے کا حکم ملا۔ ہندو سپاہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور قلعے میں جاکر سو سے زائد فرنگی افسروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ ان تمام سپاہیوں کو بعد میں گولی مار دی گئی۔ ۱۸۰۶ء میں ہی دکن میں حیدرآباد، نندی درگ، پالیم کوٹ اور والا جاہ آباد کے مقامات پر بغاوتیں ہوئیں۔

۱۸۰۷ء میں ریاست ٹراونکور میں دیوان اور ریذیڈنٹ کے درمیان بگاڑ پیدا ہو جانے کی وجہ سے شورش ہوئی۔ ریذیڈنٹ کے بھاگ جانے کے بعد اُس کی مختصر سی جمعیت کو ہلاک کر دیا گیا۔ معمولی سی بے چینی پیدا ہوئی لیکن فرنگیوں نے اس پر جلد ہی قابو پا لیا۔ ۱۸۰۸ء میں شمالی ہندوستان میں بندھیل کھنڈ میں فسادات ہوئے جو چار برس تک جاری رہے۔ ۱۸۰۹ء میں جاٹوں نے عَلمِ بغاوت بلند کیا۔ اسی سال مدارس آرمی نے بغاوت کی۔ ۱۸۱۰ء میں بمبئی پریذیڈنسی میں عبدالرحمن نے بغاوت کی۔ ۱۸۱۰ء میں بنارس میں شورش ہوئی جو اگلے برس بھی جاری رہی۔ ۱۸۱۳ء میں پرلا کیمیری کی جاگیروں میں فسادات ہوئے جو ۱۸۳۴ء تک جاری رہے۔ ۱۸۱۵ء میں کچھ کے علاقے میں فسادات ہوئے جو سترہ برس جاری رہے۔ ۱۸۱۶ء میں بریلی میں ایک سخت بلوہ پھوٹ پڑا۔ مقامی مُفتی صاحب نے جہاد کا فتویٰ دے دیا، اس طرح فوج پر حملہ کر دیا گیا۔ فوج نے مجاہدین پر سخت آتشبازی کر کے ان کو تہ تیغ کر دیا۔ ۱۸۱۷ء میں شمالی ہندوستان میں کیوٹک کے مقام پر پائیکس کی بغاوت ہوئی جو اگلے سال ہی دبائی جا سکی۔ ۱۸۱۸ء میں جنوبی ہندوستان میں بھلیس کا دھماکہ ہُوا جو ۱۸۳۱ء تک جاری رہا۔ ۱۸۲۰ء میں مرواڑا میں مرس کی بغاوت ہُوئی۔

۱۸۲۴ء میں ایک بہت بڑی شورش بارک پور میں ہوئی جب برما اور آسام کے الحاق کے موقع پر ہندو سپاہیوں نے سمندر پار جانے سے انکار کر دیا کیونکہ وُہ اُسے اپنے مذہب کے خلاف خیال کرتے تھے۔ اس وقت وہاں رجمنٹ ۴۷ تعینات

تھی انگریز کمانڈر انچیف سر ایڈورڈ ڈوپیچپٹ نے گوراپلٹن کی معیت میں وہاں جاکر میدان میں اعلان کیا کہ "تم لوگ محاذ جنگ پر جانے کے لئے بلا عذر آمادہ ہو جاؤ ورنہ اپنے ہتھیار فوراً زمین پر رکھدو۔ فوجی احکام کی پابندی ہر سپاہی کا فرض ہے" سپاہیوں نے چپ چاپ ہتھیار رکھدیئے۔ کمانڈر انچیف نے گوراپلٹن کو ان نہتے سپاہیوں پر فائر کرنے کا حکم دیا۔ سینکڑوں ہلاک ہوگئے۔ فرنگیوں نے بعد میں چن چن کر سپاہیوں کے سرغنہ سرداروں کو پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا۔

۱۸۲۴ء اور ۱۸۲۹ء میں مغربی ہندوستان کے مقام کیٹور پر دو بار فسادات ہوئے۔ ۱۸۲۴ء میں ہی گوجروں اور شیخ دولا نے شورشیں کیں۔ پھر ۱۸۲۸ء میں مغربی ہندوستان میں کولی کی شورشیں ہوئیں جو دو برس جاری رہیں۔ ۱۸۲۹ء میں شمالی ہندوستان میں خاسیس میں شورش ہوئی جو چار برس جاری رہی۔ ۱۸۳۰ء آسام میں فسادات ہوئے جو کم وبیش ۲۰ برس جاری رہے۔ ۱۸۳۰ء میں میسور میں بغاوت ہوئی جو اگلے برس بھی جاری رہی۔ ۱۸۳۰ء میں ہی وزیگا پٹم کے ضلع میں بیرابھدرا راؤزی کی بغاوت ہوئی جو ۳ سال جاری رہی۔ اگلے برس ۱۸۳۱ء میں پالکونڈا (جنوبی ہندوستان) میں بغاوت ہوئی جو ایک سال تک جاری رہی۔ پھر اسی سال شمالی ہندوستان میں باراست میں بغاوت ہوئی۔ پھر کولوں نے شورش کی جو اگلے برس بھی جاری رہی۔ ۱۸۳۲ء میں جگن ناتھ راؤزی کی بغاوت ہوئی جو ۲ سال جاری رہی۔ اسی سال شمالی ہندوستان میں من بھم کے گنگا نرائن نے بغاوت کی۔ ۱۸۳۳ء میں شیرپور (شمالی ہند) میں پیگل، پنیتھس کی بغاوت ہوئی۔ پانچ برس بعد ۱۸۳۸ء میں فیرازی فسادات ہوئے جو نو برس جاری رہے۔ ۱۸۳۸ء میں ہی بمبئی پریذیڈنسی میں نیکلدا کی شورش ہوئی پھر اگلے برس مغربی ہندوستان میں کولی کی بغاوت ہوئی۔ ۱۸۴۰ء میں اتی گڑھ، مالیگاؤں (بمبئی) سکندرآباد (دکن) اور بیجاپور میں شورشیں ہوئیں۔

۱۸۴۲ء میں بنگال کی چار رجمنٹوں نے، جنہیں سندھ جانے کا حکم ہوا تھا، علم بغاوت بلند کردیا۔ اسی برس مدارس کی بھی ایک رجمنٹ اس حکم کے خلاف اٹھ

کھڑی ہوئی۔ ۱۸۴۳ء میں جبل پور کا نام بغاوت کرنے والوں کی فہرست میں آتا ہے۔ ۱۸۴۴ء میں شمالی ہندوستان میں کوکیزی کی بغاوت ہُوئی جو چھ برس جاری رہی۔ پھر کولہاپور کی بغاوت ہوئی۔ اسی سال کولی کی شورش ہوئی جو چار برس جاری رہی۔ اسی برس ساونت وادی (جنوبی ہند) میں چھ سالہ بغاوت ہوئی۔ بمبئی پریذیڈنسی سالٹ اور پنجاب میں فیروز پور کی بغاوتیں بھی اسی سال ہوئیں۔ ۱۸۴۶ء میں خوندس کی شورش برپا ہُوئی۔ پھر اسی برس نرشماریدی کی جنوبی ہندوستان میں بغاوت ہُوئی جو اگلے برس بھی جاری رہی۔ ۱۸۴۸ء میں آپا راؤ نے بغاوت کی۔ ۱۸۴۹ء میں وفدیرآباد (پنجاب) میں بغاوت ہوئی۔ اگلے سال گوبندگڑھ اور بہرام پور میں شورشیں ہوئیں۔ ۱۸۵۲ء میں جنوبی ہندوستان میں سروے کی بغاوت برپا ہوئی۔ اسی سال وادی کاغان میں سیروں کی شورش ہوئی۔ پھر بانوچیز کی مزاحمت بھی اسی سال ہی کا نتیجہ ہے۔ ۱۸۵۳ء میں راولپنڈی اور کس رینز کی بغاوتیں ہوئیں۔ ۱۸۵۵ء اور ۱۸۵۶ء میں شمالی ہند میں سنتھل کی بغاوت برپا ہوئی۔[1]

فرنگیوں کی سخت گیر حکمت عملی سے برصغیر کے گوشے گوشے میں عام ناراضی پھیل گئی۔ وُہ یہاں کے لوگوں کو کالا آدمی کہہ کر حقارت سے مخاطب کرتے۔ ایک ہندوستانی کی سیرت کا نقشہ ذیل کے الفاظ میں کھینچا جاتا تھا۔

"نیم شیطان اور نیم بچہ، ناتربیت یافتہ، قانع، کُتّے کی طرح وفادار اور اطاعت شعار، تصوّف کا شیدائی اور خیالستان میں محو، لیکن ان اعلٰے صفات کے ساتھ ساتھ اُس میں ایک دغا باز باغی اور ایک خونخوار مذہبی دیوانہ بننے کی صلاحیت بھی موجود ہے"

اس کے برعکس ایک ادنیٰ انگریز کو بھی معزز اور قابل ترین ہندوستانی پر

---

[1] CIVIL DISTURBANCES DURING THE BRITISH RULE IN INDIA 1765–1857 زیادہ تر معلومات اسی کتاب سے لی گئی ہیں۔

ترجیح دی جاتی تھی اور اس کی سیرت یوں بیان کی جاتی۔

"متین، قابل، انصاف کی ایک نہ ٹلنے والی چٹان، اور ہر ایک کے ساتھ اُس کی حیثیت کے مطابق سلوک کرنے والا۔"

انہی حقائق کو مدِّنظر رکھتے ہوئے میلکم لوئین جج عدالت العالیہ مدارس وممبر کونسل نے اپنے ایک رسالہ میں لندن سے لکھا تھا!

"ہم نے ہندوستانیوں کی ذاتوں کو ذلیل کیا۔ ان کے قانونِ وراثت کو منسوخ کیا۔ بیاہ شادی کے قاعدوں کو بدل دیا، مذہبی رسم و رواج کی توہین کی عبادت خانوں کی جاگیریں ضبط کرلیں، سرکاری کاغذات میں انہیں کافر لکھا، اُمراء کی ریاستیں ضبط کرلیں۔ لُوٹ کھسوٹ سے ملک کو تباہ کیا۔ انہیں تکلیف دے کر مالگزاری وصول کی۔ سب سے اونچے خاندانوں کو برباد کرکے انہیں آوارہ گرد بنا دینے والے بندوبست قائم کئے۔" [1]

فرنگی راج کو اجنبی ہونے کی بنا پر ملک کی اکثریت ناپسند کرتی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ڈاکٹر ایس این سین کی تصنیف "۱۸۵۷ء" کے پیش لفظ میں تحریکِ آزادی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"چونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی نوابوں اور مغل شہنشاہ کے نام پر کام کرتی رہی، اس لئے ہندوستانیوں کو ایک عرصے تک اس کا احساس ہی نہیں ہوا کہ اقتدار ایک غیر ملکی نسل کے ہاتھ میں آگیا ہے اور خود اپنے ملک میں ان کی حالت غلاموں کی سی بنا دی گئی ہے۔ جب وسیع پیمانے پر لوگوں میں اس امر کا احساس پیدا ہوا تو بغاوت کے حالات پیدا ہوگئے۔ اور جب بغاوت ہوگئی تو یہ محض چند افراد یا کسی ایک گروہ کی سازش نہیں تھی بلکہ وسیع پیمانے پر لوگوں میں پھیلتی ہوئی بے اطمینانی کا نتیجہ تھی۔"

---

[1] بحوالہ: مسلمانوں کا شاندار مستقبل ص ۸۶ - ۸۷

عوام کی فرنگیوں کی نفرت میں اُن رائفلوں میں استعمال ہونے والے کارتوسوں نے بھی اضافہ کیا جو جنگِ کریمیا کے موقع پر ۱۸۵۳ء میں فرنگیوں نے استعمال کئے تھے اور اب انہیں ہندوستان میں بھی استعمال کیے جانے کا حکم ہوا۔ ان کارتوسوں کے کناروں پر چربی لگی ہوتی تھی جسے منہ سے توڑ کر رائفل میں رکھنا پڑتا تھا —— ہندوؤں نے اسے گائے اور مسلمانوں نے سور کی چربی خیال کیا۔

جنوری، ۱۸۵۷ء میں رانی گنج میں ایک فرنگی کا مکان اور تار گھر کو نذرِ آتش کیا گیا۔ یہ اقدام ایک طرح کا اعلان جہاد تھا۔ اپریل، ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ سے اُنیسویں اور چونتیسویں پلٹنوں نے، جو بیرام پور اور بارک پور میں تبدیل کر دی گئی تھیں، دُوسری چھاؤنیوں کی پلٹنوں کو خطوط لکھے اور اپنے ہم وطنوں کی حمیت ملّی کو جھنجھوڑا۔

تحریکِ آزادی کے قائدین کے پیشِ نظر حریت پسندوں کے درمیان رابطہ قائم کرنا ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ خفیہ پیغامات ڈاک کے ذریعہ بھیجے جانے لگے۔ اہم شہروں میں تعینات سپاہیوں کو جانے والے خطوط سے فرنگی حکام کو شک گزرا، چنانچہ سنسر کی پابندیاں سخت کر دی گئیں اور مجسٹریٹوں کو پوسٹ ماسٹر کے فرائض ادا کرنے کے لئے بلایا گیا۔

اب ایک طرف شاطر فرنگی اور اُس کا گھناؤنا اور ریشہ دوانیوں پر مبنی نظام تھا تو دوسری طرف اَن پڑھ عوام تھے جن کو پیغام کا مفہوم اور نوعیت سمجھانا مقصود تھا۔ اس مقصد کے لئے پیغام رسانی کا کوئی ایسا طریقہ وضع کرنا تھا جو خفیہ ہو اور حریت پسندوں کے دِلوں میں انقلاب برپا کر دے اور اُن کی سرگرمیوں کا فرنگیوں کو علم بھی نہ ہو سکے۔ چنانچہ کنول کے پھُولوں اور چپاتیوں کو علامت بنایا گیا۔

کنول کا پھُول فوج کے ہندوستانی افسروں کو دیا جاتا اور اُن سے توقع کی جاتی تھی کہ وُہ اپنے ماتحت ہندوستانی سپاہیوں کو انقلاب کے لئے تیار کریں گے۔

ایک کہانی اس طرح بیان کی گئی ہے کہ کسی بستی کے چوراہے میں ایک انبوہِ عظیم ایک رقاصہ کا رقص دیکھنے میں محو تھا۔ وہ ہاتھ میں کنول کا پھُول پکڑے ہوئے تھی جو اس

کے رقص کا اہم جزو معلوم ہوتا تھا۔ وہ اسے کبھی سر پر رکھتی، کبھی بازوؤں میں لیتی، کبھی سینے سے لگاتی اور کبھی چومتی۔ وہ چشمِ تجسّس کے ساتھ چہروں کو تلاش کرتی کوندتی، بل کھاتی اور تھرکتی ایک نوجوان کے سامنے جا کر تھم گئی، کنول کا پھول اسے تھما دیا ـــــ رقص ختم ہو گیا اور مجمع منتشر ہو گیا۔ شام تک ساری بستی میں اضطراب پھیل چکا تھا اور آزادی سے لوگوں کے سینے تنے ہوئے اور چہرے گلرنگ تھے۔ انقلاب کا آغاز ہو چکا تھا۔

چپاتیاں بستیوں میں تقسیم کی جاتی تھیں۔ ان کا مقصد فرنگیوں کے خلاف فضا تیار کرنا تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ سلسلہ ملک گیر ہو گیا۔ یہ کام اس تنظیم اور ہمہ گیری کے ساتھ ہوا کہ ملک کا کوئی گوشہ ان سے محروم نہ رہا۔ گیہوں اور جَو کے ملے جلے آٹے کی یہ چپاتیاں توے پر پکی ہوتیں اور اندازاً دو تولہ وزنی اور انسانی ہتھیلی کے برابر تھیں۔ ان کی تقسیم کا یہ طریقہ تھا کہ گاؤں کا چوکیدار اپنے قریبی گاؤں کے چوکیدار کو ایک چپاتی دے جاتا اور ہدایت کرتا تھا کہ اسی قسم کی پانچ چپاتیاں پکا کر آس پاس کے قریبی دیہات میں تقسیم کر دیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ چوکیداروں کو بھی علم نہیں تھا کہ یہ چپاتیاں کیوں تقسیم کی جا رہی ہیں۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ حکومت کے احکامات کے تحت ایسا ہو رہا ہے، لہٰذا فوراً اس کی تعمیل کرتے اور چپاتیاں پکوا کر نزدیکی دیہات میں بھیج دیتے۔ اس طرح ایوانِ حکومت میں ایک ہلچل مچ گئی۔ دہلی کا واقعہ ہے:

"پہاڑ گنج کے تھانیدار[۱] کے پاس، جو شہر سے باہر واقع تھا، ایک چپاتی ایک چپڑاسی لایا۔ یہ چپاتی مرد کی ہتھیلی کے برابر تھی۔ اس کا وزن دو تولہ تھا۔ تھانیدار کو تعجب ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ چوکیدار سچ کہتا ہے اور اس روٹی میں کوئی نہ کوئی اہمیت ضرور ہو گی۔ اس لئے اس کی وجہ سے تمام ہندوستانی باشندوں میں ایک گونہ خوف و ہراس چھا گیا تھا یہاں تک کہ ایک دن یہ افواہ اڑی کہ بیرام پور کی ۱۹ویں پلٹن نے کارتوسوں کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا ہے۔ جب یہ خبر پھیلی تو اندیشہ ہوا کہ کوئی مصیبت آنے

۱؎ اس کا نام معین الدین خاں تھا۔

والی ہے۔ انبالہ سے اِن دِنوں ایک ہندوستانی اخبار شائع ہوتا تھا، اس نے مختلف پلٹنوں کی کاروائی کو اور بھی شہرت دے دی۔ یہ سمجھ کر کہ ان تمام باتوں کی تہ میں کچھ کالا ضرور ہے تھانیدار نے فی الفور چند آدمیوں کو مقرر کر دیا تھا تاکہ وُہ تمام حلقوں کا معائنہ کریں اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ آیا اور دیہات میں بھی چپاتیاں تقسیم کی گئی ہیں یا نہیں اُن کی مزید تقسیم روک دیں۔" ؎۱

اِن چپاتیوں کی تقسیم کا سلسلہ ۱۲ جنوری ۱۸۵۷ء سے شروع ہو گیا تھا۔ دہلی کے قرب و جوار میں یہ فروری میں پہنچیں۔ ساگر اور نربدا کے کمشنر نے لکھا: "جنوری ۱۸۵۷ء تک گیہوں کی یہ چھوٹی روٹیاں نہایت خفیہ طور پر ایک سے دُوسرے گاؤں کو اور زیادہ تر اضلاع میں تقسیم ہو چکی تھیں"۔ اسی طرح گوڑگاؤں کے کلکٹر نے حکام بالا کو اطلاع دی کہ "جنابِ والا! میں آپ کو یہ بتانے کی عزت حاصل کر رہا ہوں کہ اس ضلع کے بہت سے دیہاتوں میں ایک اشارہ پا گیا ہے جس کا مقصد ابھی تک سمجھ میں نہیں آسکا... یہ حکم اس قدر جلد پُورا کیا جا رہا ہے کہ ایک کے بعد دوسرے گاؤں میں یہی ہوتا چلا گیا ہے اور یہ (روٹیاں) گوڑگاؤں بھی پہنچ گئی ہیں۔" نرسنگھ پور کے کیپٹن ٹرنان نے ان چپاتیوں کی تقسیم کو فرنگیوں کے لئے ایک خطرہ قرار دیتے ہوئے ساہوگڑھ کے کمشنر میجر ارسکائن کو لکھا "اس معمولی سی روٹی کا مقصد عوام کو بھڑکانا معلوم ہوتا ہے۔" اس رپورٹ کو کوئی اہمیت نہ دی گئی لیکن جب یہ تقسیم ہو گئیں تو کمپنی کی حکومت نے اس طرف توجہ دی۔ دی مفصلائٹ آگرہ مورخہ ۲۷ فروری ۱۸۵۷ء کو یہ خبر شائع ہُوئی کہ نُو بجات شمال مغرب کی حکومت کو سرکاری طور پر رپورٹ بھیجی گئی۔ گوڑگاؤں کے میجسٹریٹ کا کمشنر دہلی کے نام ۱۹ فروری ۱۸۵۷ء کو ایک خط بھی اس میں شائع کیا گیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ متھرا کے دیہات میں چوکیداروں کو چپاتیاں ملی ہیں۔ اس زمانے میں سول سروس کے ایک انگریز افسر تھارن ہل نے اس بارے میں بتایا کہ ۱۸۵۷ء میں جب وُہ متھرا میں تعینات تھا تو جنوری

؎۱ غدر کی صبح شام ص ۶۲۔

کے اواخر میں جب وہ ایکدن پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کی میز پر چار چھوٹی سی چپاتیاں پڑی ہیں جو موٹائی میں بسکٹ کی طرح تھیں۔ تھارن ہل نے مزید کہا:

ایک گاؤں میں کوئی شخص آیا تھا اور گاؤں کے چوکیدار کو ویسی ہی روٹی دیتے ہوئے ہدایت کی کہ ایسی ہی چار روٹیاں پکا کر قریبی گاؤں کے دوسرے چوکیداروں میں بانٹ دو اور انہیں بھی ویسا ہی کرنے کی ہدایت کرنا چوکیدار نے اس کی تکمیل کی۔ لیکن پولیس کو بھی تمام ماجرا معلوم تھا۔ اس سے اگلے روز اخباروں نے خبر دی کہ ایسی ہی چپاتیاں شمالی ہندوستان میں گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ گشت کر رہی تھیں۔

فرنگیوں نے پہلے تو چپاتیوں کی تقسیم کو کوئی اہمیت نہ دی لیکن بعد میں ایوانِ حکومت میں کھلبلی مچ گئی۔ تھیوفلس مٹکاف نے پہاڑ گنج کے تھانیدار معین الدین خان کو لکھ کر اس کا مقصد معلوم کیا۔ جس نے جواب میں لکھا کہ شاید کسی شورش کا پیش خیمہ ہے اور جیسا کہ اُس نے اپنے والد سے سُنا تھا کہ مرہٹوں کے شمالی علاقے پر حملے سے قبل روٹی پر جوار کی ٹہنی رکھ کر بانٹی گئی تھی۔ فرنگی حکام اور بعض "وفادار" دیسی افسروں نے اپنے اپنے دائرہ اختیارات میں اس تقسیم کو روکنے اور تحقیقات کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ معین الدین خان کے بھائی کو علی گڑھ اور متھرا روانہ کیا گیا مگر معلوم ہوا کہ وہاں بھی ان کی تقسیم عمل میں آچکی ہے۔ وہ لکھتا ہے: "معلوم ہوا کہ چپاتیاں ہر جگہ تقسیم کر دی گئیں ہر مقام پر اس سے سوالات کئے جاتے تھے لیکن کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ آئی کہاں سے ہیں اور ان کا منشا کیا ہے"[1]

فرانسیسی خاتون ہوانسٹ اپنی سرگزشت میں لکھتی ہے کہ:

"بہت سے ہندوستانی لوگ فقیروں اور سادھوؤں کے بھیس میں بغاوت کا جوش پھیلانے کے لئے گاؤں گاؤں پھرتے ہیں۔ ان کے پاس کچھ کلچے

---

[1] ایضاً ص ۵۳

ہیں جن کو وہ آپس میں تقسیم کرتے ہیں گویا یہ بغاوت اور شورش کی مفروضہ علامت ہے اور اس سے غرض یہ ہے کہ مختلف طور پر ایک سپاہی کے ہاتھ سے دوسرے تک اور دوسرے ہاتھ سے تیسرے تک جائے"[1]

چپاتیوں کی تقسیم کا مقصد فرنگیوں کے خلاف فضا تیار کرنا تھا۔ یہ منصوبہ اتنی مہارت اور خفیہ انداز میں تیار کیا گیا تھا کہ ان کی اصلیت کا راز سربستہ ہی رہ گیا۔ خود سرسید احمد خاں نے مصلحتِ وقت کی بنا پر ان کی تقسیم کو ایک معمولی اور ٹونے ٹوٹکے کی بات خیال کیا ہے۔ لیکن یہ بات حقیقت کے منافی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ منصوبہ کس کے ذہن کی پیداوار تھا؟ قرین قیاس یہی ہے کہ چونکہ یہ اودھ سے شروع ہوئیں اس لئے مولانا احمداللہ شاہ ہی اس منصوبے کے موجد تھے۔ جدید تحقیق سے یہ حقیقت ظاہر ہوئی ہے کہ اس جدوجہد کے لئے گزشتہ کئی سالوں سے مختلف سطحوں پر بڑا ٹھوس اور مثبت کام ہو رہا تھا۔ اس سلسلے میں مولانا احمداللہ شاہ، مولانا سرفراز علی اور مولانا لیاقت علی اور کئی دوسرے زعماء نے برصغیر کے دور دراز علاقوں کے دورے کئے اور جہاد کے لئے لوگوں کو تیار کیا گیا۔

اس طرح تمام ہندوستان نائرہ جنگ بن گیا۔ ۱۰ مئی کو اتوار کا دن وہ دن تھا جب وطنی غیرت، دینی تحفظ اور آزادی کی پہلی تلوار دہلی سے شمال مشرق میں کوئی چالیس میل دور میرٹھ کی زمین پر بلند ہوئی۔ تین دیسی رجمنٹوں نے اپنے افسروں کو گولی مار دی، جیل توڑ دیا اور اپنے ہتھیاروں کے ساتھ دہلی کی طرف کوچ کیا۔ میرٹھ چھاؤنی کے کمانڈر جنرل ہووٹ، جس کے ماتحت دو گورا رجمنٹیں اور کچھ آرٹلری بھی تھی، نے ان کو روکنے کی کوشش نہ کی۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر بہادر شاہ ظفر کے شہنشاہ ہندوستان ہونے کا اعلان کر دیا اور اس طرح آزادی کا پھریرا لہرا دیا گیا۔ برصغیر کے مختلف شہروں میں مجاہدین نے درج ذیل تاریخوں کو ہتھیار اٹھائے:

---

[1] - ایامِ غدر ص ۴

دہلی	۱۱ مئی
فیروزپور، مظفرنگر	۱۳ مئی
مُرادآباد	۱۹ مئی
علی گڑھ	۲۰ مئی
نوشہرہ، بلندشہر	۲۱ مئی
مین پوری	۲۲ مئی
ہوتی (مردان)، اٹاوہ	۲۳ مئی
نصیرآباد	۲۸ مئی
لکھنؤ، متھرا	۳۰ مئی
ہوڈل، بریلی، شاہ جہان پور	۳۱ مئی
یدالیون	یکم جُون
مُرادآباد	۲ جُون
نیمچ، اعظم گڑھ، سیتاپور	۳ جُون
سہارن پور	
بنارس، کان پور	۴ جُون
جُون پور، مُلتان	۵ جُون
الہ آباد، جھانسی	۶ جُون
فیض آباد، جالندھر	۷ جُون
لدھیانہ، پھلور	
فتح پور، دریاآباد، نوگاؤں، سکرورا، سلطان پور	۸ جُون / ۹ جُون
سلونی، گونڈہ	۱۰ جُون
للت پور	۱۲ جُون

باندہ، گوالیار، ہمیر پور	۱۴ جون
اورنگ آباد (دکن)	۱۵ جون
رہتک، فتح گڑھ	۱۸ جون
اندور، ہاتھرس، موساگر	یکم جولائی
سانسی	۲ جولائی
آگرہ	۴ جولائی
جہلم	۷ جولائی
سیالکوٹ	۹ جولائی
سہارن پور (دوسری بار)، برہان پور	۱۱ جولائی
داناپور، سیگولی	۲۵ جولائی
ہزاری باغ (بہار)	۳۰ جولائی
کولہاپوری، مظفرپور، رانچی	۳۱ جولائی
جائے باسایا، رولیا	۵ اگست
نصیرآباد	۱۰ اگست
نیمچ (دوسری بار)، دیوگڑھ	۱۲ اگست
بھاگل پور	۱۴ اگست
انادرہ	۲۱ اگست
ادنیپورم	۲۲ اگست
کیرالہ	۲۳ اگست
ناگوڈ	۲۷ اگست
جبل پور	۱۸ ستمبر
دیوگڑھ (دوسری بار)	۹ اکتوبر

کوئٹہ	۱۵ اکتوبر
متراگون، چھتر گاؤں	۱۸ نومبر
ڈھاکہ	۲۰ نومبر
مداری گنج (بنگال)	۴ دسمبر
چلپا شگوری (بنگال)	۵ دسمبر

بہادر شاہ ظفر

سطوتِ تیموری کے آخری نام لیوا مرزا ابوظفر ۳۰ ستمبر ۱۸۳۷ء بمطابق ۲۹ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ کو ہفتہ کے روز تخت نشین ہوئے۔ جامع مسجد دہلی کے امام میر احمد علی نے رسم تاجپوشی کا افتتاح کیا۔ بادشاہ ہو کر مرزا ابوظفر بہادر شاہ ظفر ہوئے۔ فوج نے سلامی دی، ریذیڈنٹ نے نذر پیش کی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے مبارکباد دی۔ ذوقؔ نے یہ قصیدہ پیش کیا ۔

روکش ترے رُخ سے ہُوا نورِ سحر رنگ شفق
ہے ذرّہ نیرا پرتوِ نورِ سحر رنگ شفق

بہادر شاہ ظفر کو کمپنی ایک لاکھ روپیہ ماہوار بطور وظیفہ ادا کرتی تھی۔ قلعہ کے تمام مصارف، متوسلین شاہی کی تنخواہیں، ولی عہد کا مشاہرہ، داد و دہش اور دیگر شاہی مصارف اسی میں سے ادا ہوتے تھے۔ کوئی ۲۵ ہزار روپے کے قریب آمدنی پرگنات و موضع جات وغیرہ سے حاصل ہو جاتی تھی۔ شاہی مصارف کے پیشِ نظر یہ رقم نہایت قلیل تھی۔ آپ کو یہ گوارا نہ تھا کہ ملازمین کو تنخواہیں وقت پر نہ ملیں۔ ایک دفعہ خزانچیوں کو حکم ہوا کہ "تنخواہ کی تقسیم میں چار سو روپے کم ہیں۔ جس طرح ممکن ہو انتظام کر کے تقسیم کر دو۔ انشاءاللہ جلد ادا کر دیئے جائیں گے۔"[1]

لارڈ لیک نے دہلی کی لڑائی کے بعد شاہ عالم کے وظیفہ کی اُس رقم میں کمی نہ

---

[1] بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ ص ۳۹۔

کی تھی جو مرہٹوں نے اُس کے لئے مقرر کی تھی۔ اُس کا وظیفہ ساٹھ ہزار روپے ماہوار تھا اور ستر ہزار روپے سالانہ نذر وغیرہ سے ہو جاتے تھے۔ اس طرح یہ رقم اسی ہزار پونڈ سالانہ کے قریب بن جاتی تھی۔ ۱۸۰۶ء میں یہ رقم بڑھا کر ۹۷۰، ۱۰۲ پونڈ سالانہ اور پھر ۱۸۰۹ء میں ۲۰۰۰۰۰ پونڈ سالانہ کر دی گئی۔ اکبر شاہ نے اس رقم کو کم محسوس کرتے ہوئے ۱۸۳۰ء میں اپنے ایک اہل کار کو انگلستان بھیجا تاکہ وہاں اپیل کی جا سکے۔ کورٹ آف ڈائریکٹرز نے اس شرط پر تیس ہزار پونڈ سالانہ کے اضافے کی پیش کش کی کہ شاہ ہر اُس دعوے سے دستبردار ہو جائے گا جو اُسے کمپنی کے متعلق کسی وقت بھی تھا۔ مزید برآں تیس ہزار پونڈ کی یہ رقم شاہ کے ہاتھ میں نہیں دی جائے گی۔ شاہ نے اس رقم کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ اُس کا موقف یہ تھا کہ اُسے معاہدے کی رو سے اپنے اور اپنے خاندان کی نفیس گزر اوقات کے لئے رقم کی توقع کا حق حاصل تھا۔ اس طرح یہ رقم شاہ کو کبھی نہ دی گئی[1]

۱۸۲۲ء میں کمانڈر انچیف نے شاہ کو نذر گزارنی بند کر دی۔ پانچ سال بعد ریذیڈنٹ نے بھی یہی راہ اختیار کی۔ ۱۸۳۶ء میں بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی سے محض ایک سال پہلے برطانوی افسروں کی بھی پیشکش بند کر دی گئی۔ ۱۸۴۴ء میں لارڈ ہارڈنگ نے دہلی کے ریذیڈنٹ کو لکھا کہ اس بوڑھے کی وفات کے بعد اس کے جانشین کو بغیر خاص اجازت کے مقرر نہ کیا جائے۔ ایک اور قدم آگے انگریزوں نے یہ اُٹھایا کہ بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد مرزا فخرالدین سے ایک عہد نامہ پر دستخط کرائے کہ وہ باپ کے مرنے کے بعد قلعہ انگریزوں کے حوالے کر دے گا۔ قدرت کا تماشہ دیکھیں کہ وہ ۱۸۴۹ء میں ہی ہیضے کا شکار ہو گیا۔ بعض کا خیال ہے کہ زہر دینے سے اس کا جامِ عمر لبریز ہوا۔

ایک طرف حالات یہ تھے تو دوسری طرف بہادر شاہ کی اپنی اولاد اس درجہ برگشتہ تھی کہ اُن کے مرنے کی دعائیں کرتی۔ کبھی انگریزوں سے شکایتیں ہو رہی ہیں

---

[1] MY INDIA MUTINY DIARY, P.173

اور کبھی خود ہی شاہ کے خلاف سازشوں کا جال بُن رہے ہیں۔ شہزادے سپاہ میں بھی بدنظمی پھیلانے کے ذِمّہ دار تھے، انہوں نے اپنے مختلف دھڑے بنا رکھے تھے جو اپنی اپنی پسند کے شہزادوں کے مستقل حاکم مقرر کئے جانے کے مطالبات کرتے رہتے۔ یہ بدنظمی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ سپاہی دوکانداروں پر طرح طرح کے ظلم وستم روا رکھتے۔ ان سے اجناس لیتے اور قیمت نہ دیتے۔ ان حالات میں انگریزوں کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ بادشاہ کو دہلی کے گردونواح سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ شہزادوں کو سلامی دیئے جانے کی بھی ممانعت کر دی گئی اور نہ ہی وُہ دہلی کو چھوڑ کر باہر کہیں جا سکتے تھے۔ یہ ضوابط ایسے وقت وضع کئے گئے۔ جب شاہی خاندان انگریزوں کا اچھا دوست تھا[1] ان حالات میں بہادر شاہ ظفر نے کہا: "میری بے کسی و بے چارگی کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ میں نے عہد کر لیا ہے کہ اپنی باقی زندگی یادِ الٰہی میں بسر کروں اور بادشاہی کو سلام کروں، جس میں سراسر تکالیف اور مصائب ہیں۔ اوّل خواجہ صاحب کی درگاہ میں جاؤں اور وہاں سے اپنا انتظام کر کے مکّہ چلا جاؤں۔"[2]

تحریکِ آزادی کا آغاز ہوُا تو مجاہدین نے اسّی سالہ بہادر شاہ ظفر سے استدعا کی کہ وُہ اُن کی سرپرستی کریں۔ وہ بادشاہ کو مع شہزادوں کے چاندنی چوک میں بیگم کے دروازے پر لے آئے تو آپ نے اُن سے اس طرح خطاب کیا: "میں جان ومال سے تمہارے ساتھ ہوں لیکن میرے پاس نہ خزانہ ہے نہ فوج نہ مُلک۔ ہاں جب مُلک مل جائے گا تو تم لوگوں کو عنایاتِ خُسروانہ سے نوازوں گا۔"[3]

اب ممتاز سرداروں نے اپنے سُفَراء پیغامات اور نذر نذرانے کے ساتھ روانہ کرنے شروع کئے اور اپنی اطاعت اور وفاداری کا یقین دلایا۔ ان میں

---

[1] ایضاً ص ۱۷۰

[2] تاریخ عروج انگلشیہ ص ۶۹۳

[3] نصرت نامہ گورنمنٹ ص ۱۳

اودھ کے والی برجیس قدر[1] روہیل کنڈ کے خان بہادر خان[2] اور بنجور کے محمود خان[3] شامل تھے۔ اسی طرح مختلف چھاؤنیوں میں متعیّن فوجی دستے بھی بہادر شاہ ظفر کی اعانت کو پہنچے۔ ان میں بریلی برگیڈ زیرِ قیادت بخت خان اور نیمچ برگیڈ زیرِ قیادت غوث محمد قابلِ ذکر ہیں۔ اس طرح بہادر شاہ ظفر میں نئے عزم نے کروٹ لی۔ آپ نے کئی سرداروں اور والیان کو لکھا کہ وہ اس آزادی کی تحریک میں شمولیت اختیار کریں تاکہ وہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال سکیں۔

تحریک شروع ہونے سے قبل بہادر شاہ ظفر کی حکومت قلعہ معلیٰ اور اُردو بازار کے دس پندرہ ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ آپ کا طنطنہ اور جاہ و جلال رخصت ہو چکا تھا۔ لیکن پھر بھی آپ نے معاملات کو ایک گونہ دُرست کیا اور فوج کو پابندی اور فرض کی ادائی پر زور دیا۔ امن و امان قائم کرنے کی بھرپور اور مقدور بھر کوشش کی۔ عنانِ حکومت سنبھالنے کے باوجود آپ فرنگیوں کے قتل کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے۔ لیکن جب پھر بھی کچھ لوگ اس فعل سے باز نہ آئے تو درج ذیل فرمان شائع کیا:

"چونکہ حضرت ظل اللہ سبحانی خلیفۂ صمدانی سلطان المعظم خاقان المکرّم بادشاہ عالی جاہ فلک بارگاہ نے انگریزوں کا قلع قمع کرنے کے بعد تختِ طاؤس پر، جو موروثی جلوہ گاہ سلاطین گورگانیہ کی ہے، جلوس فرمایا۔ لہٰذا حکم شاہی صادر ہوا کہ اب انگریزوں کے احوال و نفوس کا قتل و غارت موقوف رکھا جائے۔ اب احکام امن و امان جاری ہوں گے اور عدل و انصاف سے کام لیا جائے گا۔"

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۴۰۔

[2] TWO NATIVE NARRATIVES OF THE MUTINY IN DELHI, P.69

[3] TRIAL OF BAHADUR SHAH, P.24

اس فرمان کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ لوگوں نے فرنگیوں کے گشت و خون سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کے بعد آپ نے ۲۵ اگست ۱۸۵۷ء کو درج ذیل شاہی فرمان جاری کیا۔[1] اس کے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"چند ہندؤ اور مسلمان سرداروں نے جنہوں نے اپنے مذہب کے تحفظ کے لئے بہت پہلے اپنے گھروں کو خیر باد کہہ دیا ہے اور جو ہندوستان سے انگریزوں کی بیخ کنی کرنے کے لئے پوری کوششیں کر رہے ہیں، مابدولت کے رُوبرو حاضر ہوئے ہیں۔ انہوں نے موجودہ ہندوستانی جہاد میں حصّہ لیا ہے اور اس امر کا غالب امکان ہے کہ مابدولت کو عنقریب مغرب کی جانب سے فوجی کمک ملے۔ لہٰذا اطلاع عام کے لئے موجودہ اشتہار جو متعدد دفعات پر مشتمل ہے، جاری کیا جاتا ہے۔ ہر شخص کا اولین فرض ہے کہ وُہ اس اشتہار کو پُورے طور پر ملحوظ رکھے اور اس کی تعمیل کرے۔ ذریعہ معاش سے محروم اشخاص کو جو اس مشترکہ جدوجہد میں شریک ہونا چاہتے ہیں مابدولت کی طرف سے گزارہ عطا ہوگا۔ نیز ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ہندؤ اور مسلمان کی قدیم تصانیف، معجز نگاروں کی تحریروں، جیوتشیوں، پنڈتوں، رمّالوں کے حسابات سب ہی اس بات پر متفق ہیں کہ انگریزوں کا اقتدار ہندوستان میں یا کسی اور مُلک میں زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہے گا۔ اس لئے ہر فرد پر لازم ہے کہ وُہ برطانوی دور حکومت کے مزید قیام کی اُمید ترک کر دیں اور مابدولت کا ساتھ دیں اور مشترکہ مفاد کے فروغ کے لئے اپنی انفرادی اور مشترکہ مفاد کے فروغ کے لئے اپنی انفرادی کوششوں کی بدولت بادشاہی حکومت کے التفات کے مستحق بنیں اور اس طور پر اپنے اپنے مقاصد کی تکمیل کریں۔ ورنہ اگر یہ سُنہری موقع ہاتھ سے نکل گیا تو ان کو اپنی غلطی پر کف افسوس ملنا پڑے گا۔ ایک شاعر نے کتنی برجستہ بات کہی ہے جس کا مفہوم درج ذیل ہے؛

---

[1] یہ طویل اعلان دہلی گزٹ ۱۸۵۷ء میں شائع ہوا اور "فرینڈ آف انڈیا" سیرام پور مورخہ ۷ اکتوبر ۱۸۵۷ء بعنوان "دلی کا عہد سعادت" نقل کیا گیا۔

کسی سُنہری موقع کو ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دیجئے کیونکہ مقصد کے حصُول میں آپ کو گردش تقدیر سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لیکن اگر آپ نے خود موقع سے فائدہ نہ اٹھایا جو از خود آپ کی زندگی میں ہے، تو آپ کو کف افسوس ملنا پڑے گا۔"

کسی فرد کو بھی برطانوی حکومت کے خیر خواہوں کی غلط بیانی کے باعث ان معمولی پریشانیوں سے جو عام طور پر انقلابات کا لازمی جزو ہوتی ہیں۔ یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیئے کہ بادشاہی حکومت کے مستحکم قیام کے بعد بھی یہ پریشانیاں برقرار رہیں گی۔ اور ایسے اشخاص کو جن سے کسی سپاہی یا لُوٹ مار کرنے والوں نے بُرا سلوک کیا ہو ما بدولت کے حضور دادرسی کے لئے اپنی شکایات پیش کرنا چاہیں، بادشاہی حکومت کے مستقل قیام کے بعد شاہی خزانہ سے ان کی تمام جائداد کے نقصانات کی تلافی کی جائے گی۔ جو موجودہ افراتفری میں ہُوئے ہیں۔

دفعہ ۱ زمینداروں سے متعلق۔

" یہ بات صاف ظاہر ہے کہ برطانوی حکومت نے زمینداری قائم کرنے کے لئے بے اندازہ جمع ٹیکس عائد کیا ہے اور بہت سے زمینداروں کو ان کی جائداد بقایا لگان کے حصول کے لئے نیلام کر کے بے عزّت کر دیا ہے کہ کسی عام رعیّت، مُلازم یا غلام کی جانب سے دعوٰی دائر ہونے پر معزز زمینداروں کو عدالت میں طلب کیا جاتا ہے اور انہیں گرفتار کر کے قید خانے میں بند کر دیا جاتا ہے۔ زمینداروں سے متعلق مقدمات میں اسٹامپ کی بہت زیادہ قیمت اور دیوانی عدالتوں کے غیر ضروری اخراجات اور مقدمات کو سالہا سال التواء میں رکھا۔ ان سب کا مقصد مقدمہ بازوں کو مفلس بنانا ہے علاوہ ازیں زمینداروں پر مدارس، شفاخانوں اور گزرگاہوں وغیرہ کے لئے سالانہ ٹیکس عائد کیا جاتا ہے۔ بادشاہی حکومت میں اس قسم کا کوئی استحصال زر نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کے برعکس جمع ٹیکس بہت نرم ہوں گے اور ہر زمیندار اپنی زمینداری میں خود مختار ہوگا۔ زمینداری سے متعلق کل تنازعات کا تصفیہ شرع اور شاستر کی رُو سے بلا خرچ اور سرسری طور پر ہوگا۔ اور جو زمیندار موجودہ جنگ میں اپنے سپاہیوں اور روپیہ سے اعانت

کریں گے۔ ان کی نصف مال گزاری اور جو زمیندار صرف مالی امداد دیں گے ان کو ایک چوتھائی مال گزاری ہمیشہ کے لئے معاف کر دی جائے گی۔

اس جنگ میں شرکت کرنے پر ایسے زمیندار کو جو برطانوی دَورِ حکومت میں اپنی جائیداد سے محروم کر دیا گیا ہے، اس کی زمینداری واپس کر دی جائے گی اور اس کی ایک چوتھائی مالگذاری معاف کر دی جائے گی۔

دفعہ ۲ تاجروں سے متعلق

یہ امر ظاہر ہے کہ کافر اور فریب کار برطانوی حکومت تمام نفیس اور بیش قیمت اشیاء پر مثلاً تیل، پارچہ جات اور دیگر اشیاء برآمد کی تجارت پر اجارہ داری قائم کرتی ہے۔ اور محض چھوٹی موٹی چیزوں کی تجارت دوسرے لوگوں کے لئے چھوڑ دیتی ہے۔ اور اس میں بھی وہ نفع کے حصہ دار ہیں جو وہ محصول اور مقدمات میں اسٹامپ فیس وغیرہ کی شکل میں وصول کرتے ہیں تاکہ عوام محض برائے نام تجارت کر سکیں۔ علاوہ ازیں تاجروں کے نفع پر ڈاک، محصول چونگی، مدارس کے لئے چندے وغیرہ کے ٹیکس عائد کئے جاتے ہیں۔

ان تمام مراعات سے قطع نظر تجار کو رعایا کے کسی معمولی شخص کی شکایت پر قید اور ذلیل و خوار کیا جاتا ہے۔ بادشاہی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی جملہ مذکورہ فریب آمیز طریقے ختم کر دیئے جائیں گے۔ اور جملہ برّی و بحری تجارت ہندوستانی تاجروں کے لئے عام کر دی جائے گی اور ان کو اپنے مال کی نقل و حرکت کے لئے حرکت کی جانب سے دُخانی جہازوں کی سہولتیں مُفت بہم پہنچائی جائیں گی۔ علاوہ ازیں جن تاجروں کے پاس ذاتی سرمایہ نہ ہوگا ان کو شاہی خزانہ سے مالی امداد دی جائے گی۔ لہٰذا ہر تاجر کا فرض ہے کہ وہ اپنے منصب یا مفاد کے پیشِ نظر علانیہ یا پوشیدہ طور پر اس جنگ میں حصہ لے اور برطانوی حکومت کی اطاعت سے باز آئے۔

یہ امر مخفی نہیں ہے کہ برطانوی حکومت میں شہری اور فوجی ملازمتوں میں جو

ہندوستانی کام کر رہے ہیں ان کی عزت و توقیر نہیں ہے۔ ان کی تنخواہیں قلیل ہیں اور ہر قسم کے اثر و رسوخ سے محروم ہیں۔ دونوں محکمہ جات کے اعلیٰ اور کثیر تنخواہ کے عہدوں پر صرف انگریز فائز ہیں۔ فوجی ملازمت میں ہندوستانی ملازمین اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزار دینے کے بعد صوبہ دار کے عہدہ پر پہنچ جاتے ہیں (یہ اُن کی آرزوؤں کی معراج ہے) اور اُن کو ۲۰ یا ۷۰ روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتی ہے۔ اور جو شہری ملازمتوں میں ہیں وہ صرف صدر اعلیٰ کے عہدہ تک پہنچتے ہیں۔ جن کی تنخواہ پانچ سو روپیہ ماہانہ ہے لیکن ان کا کوئی اثر و رسوخ نہیں ہوتا، اور نہ انہیں جاگیر ملتی ہے اور نہ نذرانہ۔ کرنل، جرنیل اور کمانڈر انچیف کے موجودہ عہدوں کے بجائے جن پر اس وقت انگریز فائز ہیں بادشاہی حکومت کے تحت فوجی ملازمت میں پنج صدی، پنج ہزاری، ہفت ہزاری اور سپہ سالاری کے عہدوں پر ہندوستانی فائز کئے جائیں گے۔ اسی طرح کلکٹر، مجسٹریٹ، جج، صدر جج، سیکرٹری اور گورنر کے عہدوں پر بھی جو یورپینوں کے لئے مخصوص ہیں۔ وزیر، قاضی، سفیر، صوبہ نظام اور دیوان وغیرہ کے عہدوں پر بھی ہندوستانی مقرر کئے جائیں گے۔ جنہیں لاکھوں روپیہ تنخواہ دی جائے گی۔ اور اس کے علاوہ جاگیر، خلعت، انعام اور اثر و رسوخ حاصل ہوگا۔ جو ہندوستانی، چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان، انگریزوں کے خلاف لڑتے ہوئے جان بحق ہوگا، اسے جنت نصیب ہوگی۔ اور جو انگریزوں کی طرف سے لڑتے ہوئے مارے جائیں گے، انہیں بلاشبہ دوزخ میں جگہ ملے گی۔

لہٰذا انگریزی حکومت کے ہندوستانی ملازمین کو اپنے مذہب اور مفاد کو محفوظ رکھنا چاہیئے۔ انگریزوں کی اطاعت ترک کرکے بادشاہی حکومت کی حمایت کرنا چاہیئے اور فی الحال ۲۰۰ یا ۸۰۰ روپیہ ماہوار تنخواہ حاصل کرنی چاہیئے۔ اور مستقبل میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کا حقدار ہونا چاہیئے۔ اگر وہ کسی سبب سے انگریزوں کی علانیہ مخالفت کرنے سے قاصر ہوں تو ان کو چاہیئے کہ وہ انگریزوں کے بدخواہ رہیں اور واقعات کا صرف خاموشی سے تماشا دیکھتے رہیں اور ان میں کوئی عملہ حصہ نہ لیں۔"

بہادر شاہ ظفر نے اپنے ایک فرزند مرزا مغل کو سپہ سالار لشکر مقرر کیا۔ اسے

شمشیر زنی اور نیزہ بازی کا قطعاً کوئی تجربہ نہ تھا۔ اس نے مجاہدین کی مدافعانہ کارروائیوں کو مضحکہ بنا کر رکھ دیا۔ جبکہ فرنگی افواج کا دہلی پر دباؤ بڑھ رہا تھا۔ اُن کا کیمپ پہاڑی دھیرج پر تھا۔ جہاں سے انہوں نے شہر پر گولہ باری شروع کر دی۔ پہاڑ کی محاذی کمین گاہ پر قبضہ کرنے کے بعد انہوں نے کئی ایک توپیں اور منجنیقیں شہر کے بہت ہی قریبی فاصلے پر لگا دیں۔ وہاں سے اتنی شدید گولہ باری کی کہ فصیل اور بُرجوں میں شگاف پڑ گئے، ایک دروازہ گر پڑا اب فرنگیوں نے ایک اور چال چلی اور ایک دُوسرا لشکر دوسرے دروازے کی طرف روانہ کیا۔ مجاہدین اس چال کو نہ سمجھ سکے اور وہاں مدافعت کرنے لگے۔ یہی وہ منحوس گھڑی تھی جب فرنگی افواج منہدم دروازے، دیوار اور برج سے داخل شہر ہوگئیں۔ وہاں انہیں کوئی مزاحم و مدافع نہ ملا۔ ۱۹ ستمبر بروز ہفتہ بہادر شاہ ظفر نے اپنے محل کو خیرباد کہا۔ ساتھ ہی تمام اُمراء اور متعلقین بھی اپنے اہل و عیال کو لے کر گھروں میں مال و متاع کو چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کے اس فعل سے شہریوں میں سراسیمگی پھیل گئی، وہ بھی فرار ہونے لگے۔ جس کا جدھر مُنہ اٹھا، چل دیا۔ مجاہدین کو ختم کرنے کے لئے ہندوؤں نے وہ سب غلّہ چھپا دیا جو اُن کے پاس تھا۔ اسی طرح دیہات اور قصبات سے جو اناج اُن کے پاس آتا رہتا تھا، روک دیا۔ اُن کی یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ اس طرح دہلی غداروں کی وجہ سے مسخّر ہوگئی۔

بہادر شاہ ظفر پہلے درگاہ نظام الدین اولیاء میں پہنچے اور وہاں سے ہمایوں کے مقبرے میں مقیم ہوئے۔ فرنگیوں کو جب معلوم ہوا کہ شہر اور قلعہ بادشاہ اور رعایا خالی ہو گیا ہے تو افسر مع گوروں کی پلٹنوں اور گورکھوں اور ہندوستانی سپاہ کے قلعہ میں داخل ہوئے اور شہر کو گھیر لیا۔[1]

قلعہ سے ہمایوں کے مقبرے میں جانے سے قبل بخت خان نے بہادر شاہ ظفر کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ اُن کے ساتھ چلیں، پُورا

---

[1] نصرت نامہ گورنمنٹ ص ۴۳۔

ہندوستان اُن کے لئے فرشِ راہ بنا ہُوا ہے۔ لیکن مرزا الٰہی بخش، جو بادشاہ کا چچا تھا، آڑے آیا اور کہا: "لارڈ گورنر بخت خاں نے جو کچھ حضورِ عالی کے سامنے گزارش کیا ہے فدوی کو اس کے حرف حرف سے اتفاق ہے۔ مگر ایک ضروری معاملہ گوش گزار کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ لڑائی حضور سے ہے یا باغی فوج سے؟ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کی فوج اُن سے باغی ہو گئی اور سرکشی کر کے آپ کے پاس آ گئی۔ آپ مجبور تھے، آپ کے پاس طاقت نہ تھی جو اُن کو اپنے پاس نہ آنے دیتے۔ انگریز اندھے نہیں ہیں، وہ آپ کی مجبوری کو اچھی طرح جانتے ہیں اُن کو معلوم ہے کہ آپ کے نام سے باغیوں نے جس قدر کام کئے ہیں اور جیسے جیسے حکم احکام جاری کرائے ہیں اُن ہی سے ایک میں بھی آپ کا دخل نہیں ہے پھر آپ کو کس بات کا اندیشہ ہے،

فکر نہ کرنا چاہیئے۔ البتّہ اگر آپ باغیوں کے ساتھ چلے گئے تو بے شک انگریز آپ سے باز پرس کریں گے اور آپ کو مجرم قرار دینے کا ایک بہانہ ان کو مل جائے گا۔ مجھ کو ذرا بھی یقین نہیں ہے کہ باغی کسی جگہ جم کر مقابلہ کر سکیں گے۔ بخت خاں بہادر نے جو کچھ کہا اُس کو تو میں لفظاً لفظاً مانتا ہوں .... جو فوج ایسے آقا کے قبضے میں نہ رہ سکی جس کے پاس عقل بخت خاں سے زیادہ تھی تو پھر اکیلے بخت خان بیچارے کیونکر ایسی بے مُہار فوج کو مطیع کر سکیں گے۔

گرمی کا موسم ہے، برسات آ گئی ہے۔ حضور کی ضعیفی اور ناتوانی کا زمانہ ہے۔ گھر سے باہر نکل کر مسافرت میں امن بھی ہو تب بھی گھر کا سا آرام میسّر آنا محال ہوتا ہے ..... آپ چھوٹے چھوٹے شہزادوں، سہزادیوں اور پردہ نشین بیگمات کو کہاں لئے لئے پھریں گے۔ لہٰذا میری گزارش تو یہی ہے کہ آپ باغیوں کے ساتھ تشریف نہ لے جائیں۔ میں انگریزوں سے مِل کر تمام معاملات کی صفائی کرا دوں گا....."

بہادر شاہ ظفر نے اگلے دن غور کرنے کو کہا۔ اگلے روز بخت خان نے دوبارہ شاہ کو نہایت اصرار سے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ مرزا الٰہی بخش اور بخت خاں کے درمیان تُوتُکار بھی ہوئی۔ آخر کار شاہ نے بخت خاں سے کہا:

"بہادر! مجھے تیری ہر بات کا یقین ہے اور میں تیری ہر رائے کو دل سے پسند کرتا ہوں مگر جسم کی قوت نے جواب دے دیا ہے۔ اس لئے میں اپنا معاملہ تقدیر کے حوالے کرتا ہوں۔ مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دو اور بسم اللہ کرو۔ یہاں سے جاؤ اور کچھ کام کر کے دکھاؤ۔ میں نہیں، میرے خاندان میں سے نہیں نہ سہی، تم یا کوئی اور ہندوستان کی لاج رکھے۔ ہمارا فکر نہ کرو، اپنے فرض کو انجام دو۔"

بخت خاں کے پاس اب اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ شاہ کو تقدیر کے حوالے کر دے۔ شاہ نے اُس غدار پاجی مرزا الٰہی بخش کا مشورہ قبول کر لیا جو اپنی ہی منفعت کی صورت میں اپنے عزیز ترین دوست کی زندگی بھی داؤ پر لگا دیتا۔[1] فرنگی کمانڈر ولسن شاہ کی گردن زنی کے حق میں تھا جب کہ میجر ہڈسن کا خیال تھا کہ اُن کا زندہ رہنا خود اُن کے اپنے حق میں ہے کیونکہ ابھی فرنگیوں کو پورے ہندوستان پر قبضہ کرنا ہے۔ شاہ کو حوالگی کا پیغام بھیجا گیا جو بڑی رد و کد کے بعد زینت محل اور جواں بخت کی جاں بخشی کے وعدے پر منظور کر لیا گیا۔ اب شاہ مع بیگم بچوں کے مقبرے سے باہر آئے۔ زینت محل اور شہزادہ جواں بخت پالکیوں میں بٹھائے گئے اور شاہ چند خواجہ سراؤں کی معیت میں آگے آگے پیدل روانہ ہوئے۔ ان قیدیوں کو لاہوری دروازے کی طرف سے چاندنی چوک بازار کا چکر لگوا کر لال قلعہ میں زینت محل کے محل میں قید کر دیا گیا۔ شاہ کی گرفتاری ۲۱ ستمبر کو ہوئی لیکن گیرٹ (ص ۵) کا خیال ہے کہ گرفتاری ۲۲ ستمبر کو عمل میں آئی۔ گرفتار شدہ شہزادوں میں مرزا مُغل، مرزا خضر سلطان، مرزا ابوبکر اور مرزا مُغل کا بیٹا مرزا عبداللہ قابل ذکر ہیں۔ پہلے تو انہوں نے

---

[1] LIFE OF LORD LAWRENCE, P.123

لڑنے مرنے کا ارادہ کیا لیکن مرزا الٰہی بخش کے کہنے پر خود کو ہڈسن کے حوالے کر دیا۔ شہر سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر ہڈسن نے ان کو رتھوں سے اُتارا اور کپڑے اُتارنے کا حکم دیا۔ انہوں نے حیرانگی کے عالم میں اُوپر کا لباس اُتار دیا۔ ہڈسن نے خود فائر کر کے شہزادوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ پھر اُس نے اُن کا ایک چلّو خُون پیا اور کہا کہ ایسا نہ کرتا تو میں دیوانہ ہو جاتا۔ ان کے سر کاٹ کر خوان میں رکھ کر شاہ کو پیش کئے گئے تو ہڈسن نے کہا: "یہ تمہاری نذر ہے جو بند ہو گئی تھی اور جس کو جاری کرانے کے لئے تم نے غدر میں شرکت کی تھی" شاہ نے الحمدللہ کہہ کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ اس کے بعد شہزادوں کی لاشیں کوتوالی کے سامنے لٹکائی گئیں اور سر جیل کے سامنے خونی دروازے پر لٹکا دیئے گئے۔ باسورتھ سمتھ شہزادوں کے قتل کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"اور اگر کبھی کسی شیر نے اپنے پنجوں میں پکڑے بے بس شکار کے لئے رحم کا دُکھ محسوس کیا ہے تو شاید ہڈسن بھی اپنے شکاریوں کے خُون کے لئے اپنی بے صبری کو روکنے پر رضا مند ہوتا جو اتنی بلندی سے نیچے گرے تھے، حتیٰ کہ کم از کم اُن کو گونگے بہرے کورٹ مارشل کی ظاہر داری سے گزرنا پڑتا۔ تب لیکن صرف تب..."[1]

جب سارے شہر پر قبضہ ہو گیا تو خوشی میں توپیں چھوٹیں اور دیوان خاص میں ۲۷ ستمبر کو اتوار کے روز فتح کی شکر گزاری کی نماز پڑھی گئی[2] ہڈسن کو تہنیت کے پیغامات ارسال کئے گئے۔ اِکا دُکا واقعات دہلی میں ہوتے رہے۔ ۲۱ اکتوبر بروز منگل تمام شہر لال قلعہ و قلعہ سلیم گڑھ فرنگیوں کے قبضہ میں آ گیا۔ تسخیر دہلی کے ساتھ ہی اس شہر کی مصیبت و ابتلا کا دَور شروع ہو گیا۔ ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ مسلمان بالغوں کو قتل کرنے، ان کی املاک، مال و متاع وغیرہ کو لوٹنے پر ہی اکتفا نہ کیا گیا بلکہ نابالغوں

---

[1] ایضاً ص ۱۷۲

[2] عُروج عہد انگلشیہ، ص ۶۵۳

کو بھی تہ تیغ کیا گیا۔ ضعیف العمروں اور شیر خوار بچوں کی ماؤں سے اس طرح بدلہ لیا گیا جس طرح بڑے بڑے باغیوں سے بدلہ لیا جاتا ہے۔ تمام راستوں پر چوکیاں بٹھا دی گئیں اس طرح چند ایک کے سوا باقی سب فرار ہونے والے پکڑے گئے۔ ان لوگوں کے پاس جو کچھ سونا چاندی نکلتا پہلے تو وہ چھین لیتے پھر چادر، تہبند، قمیض پاجامہ جو کچھ ہاتھ لگتا نہ چھوڑتے۔ اس کے بعد افسروں کے پاس پہنچا دیتے وہ اُن کے لئے قتل یا پھانسی کی سزا کا فیصلہ کرتے۔ ۲۹ مئی ۱۸۵۸ء (۱۵ شوال ۱۲۷۴ھ) کو میاں حسن عسکری کو محض اس جرم میں پھانسی دی گئی کہ انہوں نے دو کمبل اور ایک تلوار بخت خاں کو بطور تبرک دی تھی۔

مختصر یہ کہ انتقامی جذبہ کے تحت گوری رعونت نے سیاہ فرعونیت کے ہاتھوں اَن گِنت گولیاں چلائیں۔ خود بہادر شاہ ظفر کا مقدمہ ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو شروع ہُوا۔ یہ چار ماہ انہیں نظر بند رکھا گیا تھا، مقدمہ اکیس روز جاری رہا۔ ساڑھے بارہ بجے عدالت میں پیش کئے جانے سے قبل انہیں ایک گھنٹہ تک دیوان خاص کے باہر کھڑا رکھا جاتا۔ عدالت فرنگی افسران پر مشتمل تھی۔ کاروائی سے قبل ارکان عدالت نے حلف اٹھایا، اس کے بعد سرکاری وکیل ایف جے ہیریٹ نے فردِ جرم پڑھنے کے ساتھ یہ بھی واضح کیا کہ بادشاہ سے جان بخشی کا وعدہ ہو چکا ہے۔ عدالت کو صرف یہ تحقیق کرنا ہے کہ وہ مجرم ہیں یا نہیں۔

فردِ جرم

اوّل :۔ یہ کہ کمپنی کا پنشن خوار ہونے کے باوجود کمپنی کے افسروں اور سپاہیوں کو بغاوت پر اکسایا۔

دوم :۔ ۱۰ مئی کے بعد شہزادوں اور دہلی والوں کو اور صوبجات متحدہ کے لوگوں کو، جو برطانوی رعایا تھے، لڑنے پر آمادہ کیا۔

سوم :۔ حق اطاعت ادا نہ کیا اور برطانوی حکومت سے نمک حرامی کر کے اپنے آپ کو شہنشاہ

عہد بنایا اور مسلح فوجیں اس سے لڑنے کے لئے بھیجیں۔

چہارم:۔ قلعے میں انگریز قیدیوں کو قتل کرایا اور قاتلوں کو انعام دیئے۔ دیسی ریاستوں اور حاکموں کو احکام بھیج کر انگریزوں کے قتل کی ترغیب دی۔

بادشاہ نے پہلے تو استفسار عدالت سے نہایت بے اعتنائی برتی اور جب بہت مجبور کئے گئے تو انہوں نے ان الزامات سے اپنی بریّت ظاہر کی۔

عدالت نے فردِ جرم کے ثبوت میں کئی دستاویزات پیش کیں لیکن بہادر شاہ ظفر نے یہ ثبوت بھی بے اعتنائی سے سُنے۔ دورانِ سماعت میں بعض دفعہ تو آپ اُونگھ بھی جاتے تھے البتہ وقار اور شان کا دامن نہ چھوڑا۔ حتّٰی کہ جب متعلقین اور نوکروں نے گواہی دی تب بھی ذراسی مایوسی یا پریشانی ظاہر نہ کی۔ بعض دستاویزوں سے شاہ کی رحمدلی کا بھی ثبوت ملتا تھا البتہ مکند لال، جو اپنے آپ کو شاہ کا معتمد خاص کہتا تھا، نے شاہ کے خلاف گواہی دی اور کہا کہ وُہ شاہ ایران سے بھی سازباز کر رہے تھے۔

شہادت استغاثہ کے بعد بہادر شاہ ظفر نے اپنا جواب دعویٰ پیش کیا[1] جس میں کہا گیا:

۱:۔ باغیوں نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں لڑائی کی قیادت کروں۔ میرے لئے کوئی چارہ کار باقی نہ رہ گیا تھا بصورت دیگر وُہ مجھے ہلاک کر دیتے۔

۲:۔ میری طرف سے جو احکام جاری ہوئے وُہ دراصل خود باغی جاری کرتے مسودے لاتے اور زبردستی مجھ سے دستخط کرا لیتے تھے۔

۳:۔ میں کسی انگریز کے قتل کی سازش میں شامل نہیں ہُوا بلکہ میں نے کوشش کی کہ قلعہ سے متعلق انگریزوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے۔ لیکن میں چونکہ باغیوں کے معاملات میں کسی مؤثر طریقے سے مداخلت نہ کر سکتا تھا اس لئے انہوں نے میری رضامندی کے خلاف چند انگریزوں کو قتل کر دیا۔

---

[1] غلام عباس بہادر شاہ ظفر کا وکیل تھا۔

۱۴۔ میں باغیوں کو تشدد سے روکتا تھا تو وہ میرے خاص مشیروں مثلاً حکیم احسن اللہ خان، محبوب علی خاں اور زینت محل بیگم پر انگریزوں سے سازش کا الزام رکھ دیتے تھے۔ ایک دن انہوں نے حکیم احسن اللہ خاں کا مکان لوٹنے کے بعد انہیں قتل کرنا چاہا تو میں نے بصد منت سماجت ان کو اس فعل سے باز رکھا۔

الغرض شاہ کو مجرم ثابت کرنے کی بحث جاری رہی۔ سرکاری وکیل کے بحث کا اصل محور یہ تھا کہ "پہلا شخص، جس کی طرف باغیوں نے رجوع کیا، بادشاہ تھا۔ اس لئے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بادشاہ سازش میں شریک تھا۔"[1]

عدالت نے جب "فیصلہ" سنایا تو کہا:

"عدالت بہ اعتبار شہادت اس فیصلے پر پہنچتی ہے کہ محمد بہادر شاہ سابق بادشاہ دہلی کے خلاف تمام الزامات ثابت ہو گئے ہیں۔"

۱۷ اکتوبر ۱۸۵۸ء کو جمعہ کے روز بہادر شاہ ظفر کو کلکتہ بھیج دیا گیا[2] گرفتاری اور جلاوطنی کے بعد بہادر شاہ ظفر کا نام خطبہ سے ہٹا دیا گیا[3] شہر بدر ہوتے وقت شاہ نے یہ اشعار کہے:

گر رحم غریبی پہ مری گردشِ ایام ... بدعہدیٔ دوراں نہ کراتنا مجھے بدنام
برگشتگیٔ بخت نہ رکھ اتنا مجھے بدنام ... اے شوخیٔ طالع نہ کر اتنا مجھے بدنام
بے مہریٔ جاناں تو مرے ساتھ وفا کر ... اے نالۂ شبگیر میرے حق میں دعا کر
اے رنج تو ہی دل کی مسرت کا سبب ہو ... حرماں تو ہی اب دافعِ اقسام تعب ہو
اے شورشِ دل واسطہ دوریٔ تپ ہو ... اے روزِ سیا جلد کہیں وصل کی شب ہو
اے گروہ سیار تو آنکھوں کو ضیا دے ... اب ہاں میری کشتی کو کنارے سے لگا دے
اے دستِ جنوں میرے گریباں سے خبردار ... اے خارِ مغیلا میرے داماں سے خبردار

---

[1] ایچ ایل اوگیرٹ، مقدمہ ص ۲۳۷
[2] نصرت نامہ گورنمنٹ ص ۴۴
[3] ULEMA IN POLITICS, P.254

مجھ عاشقِ جانباز کو کیوں تو نے ستایا
بتلا دے کسی بات میں باہر مجھے پایا
زندہ کو تو مردہ کیا، مُردے کو جلایا
ای عیسیٰ دوراں تجھے کو کچھ رحم نہ آیا
کیوں چرخِ ستم گر میرا یہ حال پتہ ہے
شہباز کو گنجشک کے پنجے میں رکھا ہے

چونکہ جواں بخت اور زینت محل پر کوئی فردِ جُرم عائد نہیں تھی اِس لئے اُن کو شاہ کے ساتھ جلاوطنی میں رہنے کی اجازت مِل گئی۔ بصُورت دیگر وہ بنگال کے پریذیڈنسی کے اضلاعِ زیریں میں کسی ضلع میں شاہی قیدیوں کی طرح مفید رہ سکتے ہیں۔ شاہ کی دوسری بیگم تاج محل کلکتہ سے واپس چلی آئی۔ کلکتہ میں اودھ کے معزول والی واجد علیشاہ نے وائسرائے کی وساطت سے شاہ کی خدمت میں دعوت نامہ بھیجا۔ شاہ نے دعوت تو منظور نہ کی اور لکھ بھیجا کہ "چند منٹ کے لئے جہاز سے اُتر کر میٹا بُرج میں تم سے ملوں گا"۔ چنانچہ اُس روز فرنگی حکام بمعہ والسرائے میٹا برج میں جمع ہوئے تاکہ ملاقات کا منظر دیکھیں۔ جب شاہ جہاز سے اُتر کر حدُود میٹا برُج میں تشریف لائے تو واجد علیشاہ نے باوجود بھاری بھرکم ہونے کے ادب سے سر جُھکا کر اکیس سلام کئے۔ دونوں اشکبار تھے اور رقت کا عالم کتنی ہی دیر قائم رہا۔

کلکتہ سے شاہ کا یہ قافلہ رنگون کے لئے روانہ ہوا جہاں انہوں نے جلاوطنی کے دن کاٹنے تھے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی نے شاہ کی حراست کے متعلق یوُں لکھا ہے،

" بادشاہ کو گورے منہ، سیاہ دل، گندمی بال اور کجی آنکھ والوں کی حراست میں سوئی کے سوراخ سے بھی تنگ کوٹھری میں مقید کر دیا" قید فرنگ میں صرف چھ سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ زینت محل کے پاس کچھ زیورات تھے، انہی کو معاش کا ذریعہ بنایا گیا۔

فرنگی بہادر شاہ ظفر کو انتہائی ضعف پیری کے باوجود ایک خطرہ ہی سمجھتے تھے اسی لئے ہندوستان کی سرزمین سے نکال کر رنگون میں قید کیا۔ یہ خطرہ وہاں بھی ایک زندہ وجود کی صُورت میں موجود تھا جس کا علاج یہ تلاش کیا گیا کہ شاہ کو قیدِ تنہائی میں رکھا گیا۔ نہ کسی کو ملنے کی اجازت تھی، نہ ان کا ہی کوئی حال معلوم کر سکتا تھا۔ غرض کہ خاندان مُغلیہ کے اس آخری چراغ کا پیمانہ عمر، نومبر ۱۸۶۲ء (۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۹ھ) بروز

جمعۃ المبارک دن ڈھلے لبریز ہوگیا۔ وام واپسیں کے وقت تین آدمی، ایک بیوی اور دو بچوں کے سوا کوئی موجود نہ تھا۔ اس طرح شاہ جہاں آباد کا یہ گوہر آبدار رنگون کی خاک میں ابدی نیند سوگیا۔

تاریخ وفات اس طرح نکالی گئی؛

چودہ جمادی الاولین، جمعہ کا روز وقتِ عصر
حالتِ قید وبیکسی تھی، یہ گھڑی بہت کٹھن
موت نے شاہ ہند سے عرض کیا وطن سے دُور
خلد ہے آپ کا وطن اے ظفر چلا وطن

(۱۲۷۹ھ)

جہاں نظر بند تھے، وہیں دفنائے گئے۔

شاہوں کے مقبروں سے الگ دفن کیجئو
ہم بیکسوں کو گورِ غریباں پسند ہے

آدھی شب کے وقت انہیں دفن کر کے زمین برابر کر دی گئی۔ پاس بیری کا درخت تھا، وہی بالائے قبر کا نشان باقی رہ گیا۔ ایک زمانے تک شاہ کے پوتے سکندر بخت قبر کی مجاوری کرتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد یہ احاطہ ایک انگریز ڈانسن کو ٹھیکہ پر دے دیا گیا جس نے قبر کے ایک طرف ٹینس کھیلنے کا میدان بنایا اور دوسری طرف گھوڑے سدھانے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ جب لوگ فاتحہ پڑھنے کے لئے آنے لگے تو اردگرد چار دیواری اٹھا کر پہرہ قائم کر دیا گیا۔ ۱۸۸۲ء میں پہلی بار دہلی کی جامع مسجد میں نمازِ مغرب کے بعد شاہ کے لئے دعائے مغفرت کی گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد ہندوستان میں یوم بہادر شاہ بھی منایا جانے لگا تو حکومت نے ایک نیا خطرہ محسوس کیا۔ چنانچہ قبر کے احاطے میں داخلہ پر سے پابندی اٹھائی گئی مگر بعد مغرب کسی کو ٹھہرنے نہ دیا جاتا تھا، نہ ہی قبر پر کسی قسم کے مظاہرہ کی اجازت تھی۔ ان پابندیوں کے باوجود جو شخص بھی فاتحہ پڑھنے جاتا وہ وہاں ایک چراغ ضرور جلا آتا۔ لیکن یہ فوراً ہی گُل ہو

جاتا۔

پسِ مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا!
اُسے آہ دامنِ باد نے سرِ شام ہی سے بجھا دیا

طرح طرح کی چہ میگوئیاں گردش کرنے لگیں۔ آخر معلوم ہُوا کہ چوکیدار کو یہ حکم ہے کہ چراغ جلانے سے کسی کو نہ روکا جائے لیکن بعد میں اسے گل کر دیا جائے۔ آخر وقت نے قبر کا نشان ہی محو کر ڈالا پھر بیسویں صدی کے اوائل میں عبدالسلام نامی ایک شخص نے قبر کا سُراغ لگایا۔

بہادر شاہ ظفر نے تحریک کے دنوں میں چار ماہ آٹھ روز آزاد حکومت کی۔۔۔ فرمانروائی کے ساتھ اقلیم سخن کی بادشاہی بھی کی۔ آپ کے کلام میں خلوص، سوز و گداز حرماں نصیبی، محرومی اور داخلیت موجود ہے۔

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

پھر فرمایا۔

جو آگیا ہے اس عمل تیرہ رنگ میں
قیدِ حیات سے ہے وہ قیدِ فرنگ میں

مولانا فضل حق خیر آبادی اپنی کتاب الثورۃ الہندیہ میں شاہ کو حسرتِ کشیدہ دل تپیدہ لکھتے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے شاہ کا حُلیہ یوں بیان کیا ہے:

" دہلی میں وُہ کون ہے جس نے ظل اللہ کو نہ دیکھا۔ میانہ قد بہت نحیف جسم کسی قدر لمبا چہرہ، بڑی بڑی روشن آنکھیں، آنکھوں کے نیچے ہڈیاں بہت اُبھری ہوئی، لمبی گردن جو کا ذرا اونچا، پتلی ستوان ناک، بڑا دہانہ، گہری سانولی رنگت چھدری داڑھی، گلوں پر کم، ٹھوڑی پر ذرا زیادہ، لبیں کُتری ہوئیں، ستر برس سے اونچی عمر، بال سفید بھک، لیکن پھر بھی داڑھی میں اِکا دُکا سیاہ بال، چہرے پر جھریاں لیکن باوجود اس پیرانہ سالی اور نقاہت کے آواز میں وہی کرارا پن، سبز کمخواب کا ایک

برکا پائجامہ اور سفید ڈھاکہ کی ململ کا کُرتہ زیب تن، سامنے ایک چوکی پر جامہ وار کی خفتان اور کارچوبی چوگوشیہ ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔"[1]

امر واقعہ یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر ایک رحمدل انسان تھے۔ مخالفین کے لیے بھی نرم گوشہ رکھتے تھے۔ تحریک کے شروع ہونے کے بعد فرنگیوں کے قتل کی بالکل اجازت نہ دی، جو کچھ ہوا وہ عوام الناس نے آپ کے احکامات سے قطع نظر کیا۔ ۳۰ مئی ۱۸۵۷ء سے دہلی کی تاریخ ۲۰ ستمبر تک مقتولین، مجروحین اور گم شدگان کی تفصیل ملاحظہ ہو:

تفصیل	یورپی افسر	ہندوستانی افسر	نان کمیشنڈ افسر	ڈرم (باجہ بجانے والے)	سپاہی	میزان
مقتول	۴۶	۱۴	۸۰	۷	۸۶۵	۱۰۱۲
مجروح	۱۴۰	۴۹	۲۰۷	۱۰	۲۳۸۹	۲۷۹۵
گمشدہ	-	-	۱	-	۲۹	۳۰
میزان	۱۸۶	۶۳	۲۸۸	۱۷	۳۲۸۳	۳۸۳۷

محاصرے کے آخری دنوں میں شاہ نے فوج کے لیے فنڈ حاصل کرنے کے لئے اپنے ذاتی اثاثے نیلام کرنے کی بھی اجازت دے دی[2] ناکامی آپ کے مقدر میں لکھی ہوئی تھی۔ آپ اہل وطن کو بیرونی تسلط سے نجات نہ دلا سکے لیکن آپ کی ایک بیٹی ربیعہ بیگم حسینی باورچی کے عقد میں اُٹھ گئی۔ خود زندگی کے آخری دن نہایت عُسرت اور غم و اندوہ میں بسر کیے لیکن اس سے تحریک آزادی کے جہاد میں آپ کے کردار کی عظمت کسی طور بھی نہیں گھٹائی جا سکتی۔

---

[1] - دِلّی کی آخری شمع ص ۲۲ - ۲۳

[2] حکیم احسن اللہ خاں کی یادداشتیں ص ۳۰

بیگم حضرت محل

۱۳ فروری ۱۸۵۶ء کو صُوبہ اودھ کا الحاق عمل میں آیا جس کے نتیجہ میں واجد علی شاہ کو بد نظمی کے الزام میں معزول کر دیا گیا۔ میجر جنرل سر جیمس آؤٹ رم کو اودھ کا چیف کمشنر مقرر کیا گیا۔ وُہ اگرچہ تجربہ کار تھا لیکن خرابیٔ صحت کی بنا پر دو ماہ بعد رخصت پر چلا گیا۔ اُس کے بعد جیکسن نے اختیارات سنبھالے۔ جب اُس کی ناتجربہ کاری کی بدولت پُورا علاقہ جلد ہی بے اطمینانی کا شکار ہو گیا تو مارچ ۱۸۵۷ء میں سر ہنری لارنس نے اُس کی جگہ لی۔ اُس نے پنجاب میں نظم و نسق کے شعبے میں بڑا نام پیدا کیا تھا لیکن وُہ بھی لوگوں کی عدم اطمینانی کو دُور نہ کر سکا۔ یہی وُہ حالات تھے جب جنگ آزادی کا آغاز ہُوا۔ اس وقت لکھنؤ میں چھاؤنیاں تھیں۔ ریذیڈنسی، مچھی بھون اور منڈھیاؤں فرنگیوں نے خطرے کے پیش نظر درج ذیل اقدامات کر لیئے۔

۱:۔ مچھی بھون میں کچّے مکانات مسمار کر کے جابجا توپیں نصب کر لیں۔ دو بڑی توپیں قلعہ گومتی کے پُل پر نصب تھیں۔

۲:۔ حسن باغ مملوکہ محسن الدولہ کو لے کر ہموار کر دیا گیا۔

۳:۔ اُمراءِ شہر کو صرف اپنی حفاظت کے لئے سپاہی رکھنے کی اجازت دی گئی۔

۴:۔ کثیر تعداد میں غلّہ اور سامانِ جنگ قلعہ مچھی بھون میں غار اور کھتّے کھود کر رکھا گیا اور اردگرد اس خیال سے کنستروں میں بارُود رکھ دیا کہ اگر مجاہدین کی فتح کے آثار ہوں تو ان کو نذرِ آتش کر دیں گے۔

۵:۔ مچھی بھون کی نہر میں پانی بھر دیا گیا۔

۶:۔ پینتیس لاکھ روپے پہلے مچھی بھون اور پھر ریذیڈنسی میں رکھے گئے۔

۷۔ ریذیڈنسی کے گرد جتنی کوٹھیاں تھیں ان کے ساتھ ساتھ دھس باندھ کر مثل قلعہ مستحکم کیا اور توپیں نصب کیں۔ جتنے مکانات سامنے تھے دُور تک مسمار کرا دیئے اور درخت کٹوا دیئے۔[1]

مجاہدین ۲۳ جُون ۱۸۵۷ء کو لکھنؤ پہنچے اور ۳ جولائی کو فوج کی منادی ہُوئی اور راجہ جے لال سنگھ پسر راجہ درشن سنگھ نے بیگم حضرت محل بنتِ رمضان علی مرزا برجیس قدر کی مسند نشینی کی استدعا کی۔ چنانچہ ۵ جولائی کو برجیس قدر، جن کی عمر محض گیارہ برس تھی، احمد حسین کی تحریک اور نواب ممّو خاں کی تائید سے مسند نشین ہوئے۔ شہاب الدین اور سیّد برکات احمد سالار نے مندیل شاہی آپ کے سر پر رکھی۔ تمام افسروں نے تلوار نذر گزاری اور گیارہ توپوں کی سلامی دی مسند نشینی کا اعلان اس طرح تھا: "خلق خدا کی، مُلک شاہِ دہلی کا اور حُکم برجیس قدر کا"۔ مسند نشینی کے بعد برجیس قدر نے نواب وزیر کہلوانا پسند کیا تاکہ دہلی کے ساتھ تعلقات کی تجدید ہو سکے۔ فرنگیوں نے غازی الدین حیدر کو شاہ کے لقب سے محض دہلی کے اثر و رسُوخ کم کرنے کے لئے نوازا تھا۔

اب بیگم حضرت محل برجیس قدر کی نگران اور سرپرست بنیں اور علی محمد عُرف ممّو خاں داروغہ بیگم حضرت محل مختار مقرر ہُوئے۔ محبوب خاں کے سپُردِ محکمۂ عدل، مال، پولیس اور فوج حوالے کئے گئے۔ برجیس قدر نے شرف الدولہ کو خلعت نائب دیوانی عطا کیا جب کہ خلعت دیوانی مہاراجہ بال کرشن کو ملا۔

دوسرے روز تمام اہل پنشن یافتہ افراد کو اُن کے عہدوں پر فائز کر دیا گیا۔ برجیس قدر کی مسند نشینی کے وقت لوٹ مار کا بازار گرم تھا، نظم و نسق معطل تھا اور عوام کی زندگی اجیرن تھی۔ سب سے پہلے برجیس قدر نے اسی مفسدہ

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۱۹۴

کی طرف توجہ دی۔ چنانچہ پہلا فرمان، جو آپ نے جاری کیا، وہ یہ ہے[1]

"اب کوئی کسی کو شہر میں نہ لوٹے، وگرنہ سزا پائے گا۔"

اِسی ضمن میں سپاہیوں اور افسروں کو یوں خطاب کیا!

"اے بہادرو! ہم تم سے بہت خوش ہیں، خوب لڑتے ہو۔ مگر ہمیں ایک بات کا رنج ہے کہ تم شہر کو لوٹ رہے ہو، اسے موقوف کر دو، وگرنہ سب رعایا بد دُعا دے گی۔"

افسروں نے دست بستہ عرض کی؛ جناب عالی! اب شہر نہ لُٹے گا۔[2]

نئی انتظامیہ نے برجیس قدر کے نام کے درج ذیل دو سکّے جاری کیے:

(۱) سکّہ زد بر سیم و زر چوں مہر بدر
نیّر دیں مرزا برجیس قدر

(۲) سکہ زد از فضل حق بر اشرفی مہر و بدر
اختر سلطان عالم، میرزا برجیس قدر

اب لکھنؤ سرفروشوں کا مسکن بن گیا۔ گرد و نواح سے غول کے غول ادھر اُمڈ آئے۔ مولانا احمد اللہ شاہ بھی یہیں تھے اور اقتدار کے مالک بھی تھے۔ بیگم حضرت محل نے اُن سے تصادم کی بجائے اُن سے برجیس قدر کی سرپرستی کی استدعا کی۔ چنانچہ بیگم حضرت محل تمام اُمور سلطنت میں نواب ممّو خاں کے علاوہ مولانا احمد اللہ شاہ سے بھی رائے لیتیں، انہیں مشیر خاص مقرر کیا۔ تحریک کے دِنوں میں "چو لکھی" نامی عمارت میں مولانا کا قیام تھا اور اِسی عمارت میں ان کا کاروبار ہوتا تھا۔[3]

---

[1] ایضاً ص ۲۲۷

[2] ایضاً ص ۲۳۳

[3] ہندوستان میں مشرقی تمدّن کا آخری نمونہ ص ۵۶۔

بیگم حضرت محل نے رؤسا اور تعلقہ داران اودھ کو انقلاب میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ کولہا پور کے راجہ کو ایک تلوار تحفہ میں بھیجی تاکہ اُسے ترغیبِ جہاد ملے لیکن اُس کی حمیّت آزادی بیدار نہ ہوئی۔ بلکہ راجہ سانگلی اور جمکھنڈی سے خط و کتابت کرتا رہا۔ لعد میں ۱۵ دسمبر ۱۸۵۸ء کو بے قاعدہ فوج اور عوام کا ہُلّڑ لے کر اُٹھا لیکن بالآخر مُنہ کی کھائی۔

برجیس قدر کی طرف سے مختلف تعلقہ داروں کو روانہ کیئے گئے فرمان کا متن درج ذیل ہوتا تھا۔

"فضلِ خُدا سے بتاریخ سعید روز نیک ما بدولت و اقبال نے مسند آبائی پر جلوس فرمایا، تمہیں لکھا جاتا ہے کہ کوئی انگریز مع فوج و اہلکار کسی گھاٹ سے تمہارے علاقے میں اُترنے نہ پائے۔ جس طرح سے مقابلہ کرنا اور لغور دیکھنے حکم نامہ ہذا مع فوج و توپ در دولت پر حاضر ہونا، تاکید جانو۔"

لیکن اس حُکم نامہ کا جواب خاطر خواہ نہ ملا، نرپت سنگھ تعلقہ دار روہیانے لکھا: "پروانہ کرامت نشانہ حضور مشعر اجلاس فرمائی آیا، سرفراز و ممتاز کیا۔ اللہ تبارک تعالےٰ مبارک کرے۔ خانہ زاد کی گڑھی سے علاقہ انگریزی قریب ہے فقط دریائے گنگ درمیان ہے۔ خانہ زاد کا آنا مصلحت وقت نہیں ہے۔ انشاء اللہ اگر کفار قصد عبور گنگ کریں گے، اقبال سرکار سے مقابلہ کر کے قتل کروں گا۔ واجب تھا عرض کیا۔"

جو تعلقہ دار حاضر نہ ہوئے ان میں ہردیو سنگھ، ماکھن سنگھ زمیندار بانگر منو، میر غلام جعفر زمیندار عثمان پور، میر عالم علی زمیندار بالوں، بھیکن خاں زمیندار کھوتی وغیرہ شامل تھے۔ لیکن جنھوں نے حکم نامے کی تعمیل کی اُن میں لال بلونت سنگھ، راجہ کالا کانکر، بالجر گلاب سنگھ تعلقہ دار نردل، نواب علی خاں رئیس محمود آباد، درگبیج سنگھ، منشی محمد حسین قدوائی، حشمت علی سندیلہ، منصب علی رسول آباد، کلو خاں نانپارہ وغیرہ۔ بعض رؤساء اپنی فوج کو اپنے پاس سے خوراک دیتے تھے۔

اس کمک کی تفصیل یوں ہے :

راجہ دیبی بخش سنگھ، راجہ گونڈا	۳ ہزار سپاہی
اَنندی اور خوشحال وغیرہ تعلقہ دار گوشائیں گیج	۲۰ ہزار سپاہی
راجہ سکھ درشن زمیندار سمر دتہ	۷ ہزار سپاہی
سبھرام بخش زمیندار سمر دتہ	۴ ہزار سپاہی، ۳ ضرب توپ
راجہ لال مادھو سنگھ، تعلقہ دار گڑھی امیٹھی	۵ ہزار سپاہی ۴ ضرب توپ ۲۰۰ سوار
رانا بینی مادھو سنگھ، تعلقہ دار بلیسواڑہ	۵ ہزار سپاہی، ۵ ضرب توپ ۴۰۰ سوار
حشمت علی چوہدری، تعلقہ دار سندیلہ	۴ ہزار سپاہی
میر منصب علی، تعلقہ دار رسول آباد	۱ ہزار سپاہی
رگھناتھ سنگھ، تعلقہ دار کھجور گاؤں	۲ ہزار سپاہی، ۴ ضرب توپ
کلو خاں کارندہ نانپارہ	۱۰ ہزار سپاہی

بیگم حضرت محل نے بہادر شاہ ظفر کو تحفے تحائف بھیج کر اودھ کی آزادی کا مژدہ سنایا۔ سفارت کے فرائض عباس مرزا کو سونپے گئے جنہوں نے مراد آباد کے راستے دہلی کا سفر اختیار کیا۔ کئی لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ انگریز حق پر ہیں۔ ڈپٹی کلکٹر مراد آباد ولایت حسین نے اپنی وساطت سے عباس مرزا کو انگریز حکام سے رابطہ قائم کرنے کا مشورہ دیا جسے انہوں نے مسترد کر دیا۔ ۱۳ ستمبر کو دربار دہلی میں حاضر ہوئے۔ جیون لال لکھتا ہے :

"نماز کے بعد نذیر حسین مرزا نے عباس بیگ کا لکھنؤ کے دربار کے ایلچی کی حیثیت سے تعارف کرایا۔ اس نے بادشاہ کو دو طلائی اشرفیوں کی نذر پیش کی۔ جلالت الملک نے اُسے سفیر الدولہ کے خطاب سے نوازا۔"

بیگم حضرت محل کی حکمت عملی اور تدبر سے پورے اودھ پر آزاد حکومت قائم ہوئی۔ صرف گیارہ روز میں اودھ کے تمام اضلاع میں انگریزی عملداری ختم ہوگئی سرہری۔

لارنس نے لیفٹیننٹ گورنر کو ایک مُراسلے میں لکھا: "سارے اضلاع ہماری حکومت سے نکل گئے اور ہر روز حالت بگڑتی جا رہی ہے۔ سارے تعلقہ دار مسلح ہو رہے ہیں اور بعض نے دیہات پر قبضہ کر لیا ہے"۔[1]

مصارفِ جنگ کو پورا کرنے کے لئے بیگم حضرت محل نے گھر کا اثاثہ سیم وزر قربان کر کے چار لاکھ روپیہ جمع کیا۔ دیگر اُمراء سے بہ جبر جو روپیہ لیا گیا، اس کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے؛[2]

سامان نقد و جنس	۱۸ لاکھ روپیہ
جواہرات	۲ لاکھ روپیہ
متفرقات	۱ لاکھ روپیہ
اچھے صاحب	۵۰ ہزار روپیہ
میر احسان علیخاں	۵/۴ ہزار روپیہ
منجھلی بیگم	۱۰ ہزار روپیہ
محمد بخش داروغہ	۵ ہزار روپیہ
چندی سہائے دیوان نواب صاحب	۵ لاکھ روپیہ
اہل شہر سے	۵۵ لاکھ روپیہ

بیگم حضرت محل نے جنرل حسام الدولہ کو عام بھرتی کا چارج دیا۔ کچھ ہندو اُن کے پاس پہنچے اور گزارش کی: "یہاں کے سب آدمی انگریزوں سے ملے ہوئے ہیں۔ اس میں خرابی ہے۔ پھر کہیں ٹھکانہ نہیں۔ جس طرح بنتا ہے دھاوا کر کے ہم بیلی گارد[3] میں گھس جائیں گے۔ رام چاہے تو کل انگریز نہیں یا ہم نہیں۔ جب تک بیلی گارد فتح نہ کریں

---

[1] عروج عہد انگلشیہ ص ۸۱۸

[2] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۴۵

[3] ریذیڈنسی کی عمارت بیلی گارد کہلاتی تھی جہاں ریذیڈنٹ رہا کرتا تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا نمائندہ ہوتا تھا۔

گے، تنخواہ نہ مانگیں گے۔ ہمارے برہمن پنڈت علم نجوم سے کہتے ہیں کہ برجیس قدر کی سلطنت کلکتہ تک ہے، بڑا صاحب اقبال ہے اچھی ساعت میں گدی پر بیٹھا ہے[۱]۔

چنانچہ تمام تعلقہ داروں اور زمینداروں کے نام احکامات جاری ہوئے کہ:

"ملک آبائی خدا نے ہم کو عطا کیا۔ دفع کفار فرنگ لازم ہے۔ باہم شریک ہو کر باقی ماندگان بیلی گارد کو قتل کر دو۔ جوان کو قتل کرے گا، اس کا نصف علاقہ اس کو معاف ہو گا"[۲]

منادی ہوئی کہ پرسوں بیلی گارد پر حملہ ہو گا۔ مسلمانوں نے قرآن مجید اور ہندوؤں نے گنگا جل اٹھا کر قسم اٹھائی کہ جب تک محصورین کو تہ تیغ کر کے بیلی گارد کو زمین کے برابر نہ کر دیا جائے گا کھانا پینا اور اپنا ذاتی کام کرنا سب حرام ہے۔ کل انگریز نہیں یا ہم نہیں[۳]۔

حریت پسندوں نے ۳۱ جولائی کو پہلا حملہ مولانا احمد اللہ شاہ کی قیادت میں بیلی گارد پر کیا۔ حملے کے روز بیگم حضرت محل کو شب بھر نیند نہ آتی تھی۔ لوگ ان کی مستعدی اور نیک نفسی کی تعریف کرتے۔ وہ سپاہیوں کی نہایت قدر کرتیں اور حوصلہ سے زیادہ انعام دیتیں[۴]۔ اگست میں لڑائی کا زور بہت ہو گیا۔ جنرل سید برکات احمد اور کپتان صوبہ سنگھ نے اپنے اپنے رسالوں کے ساتھ بیلی گارد پر زبردست حملہ کیا کہ اس کی سب سے بڑی خندق اڑ گئی۔ مجاہدین زینے لے کر آگے بڑھے اور دیواروں پر چسپاں کر دیئے اور توپ کی زدوں میں گھس گئے[۵]۔

---

[۱] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۴۲

[۲] ایضاً ص ۲۴۹

[۳] عروج عہد انگلشیہ ص ۸۱۸

[۴] ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ ص ۵۹

[۵] عروج عہد انگلشیہ ص ۸۶۴

اس وقت مجاہدین کو اتفاق کی سب سے اشد ضرورت تھی لیکن بدقسمتی سے مولانا احمد اللہ شاہ اور نواب ممّو خاں کے درمیان ٹھن گئی۔ اس کشمکش سے مجاہدین میں بددلی پھیل گئی۔ غداروں، منافقوں اور جاسوسوں کو کھل کر کھیل کھیلنے کا موقع ہاتھ آیا۔ عالم باغ اور دلکشا کی لڑائی اس المیہ کا عبرت انگیز مرقع ہے۔ بیگم حضرت محل مجاہدین کے حوصلے بڑھانے کے لئے مختلف اقدامات کرتی رہیں۔ معرکہ عالم باغ کے سلسلہ میں راجہ مان سنگھ کو ان کی غیر معمولی جانفشانی کے صلہ میں علاوہ خلعت رومال اور دوشالہ کے ساتھ "فرزند خاص" کا خطاب دیا اور ملبوس خاص سے اپنا دوپٹہ عنایت کیا اور فرمایا کہ بعد فتح کے بہت سا روپیہ اور جاگیر دی جائے گی۔[1]

۹ نومبر کو فرنگی فوج نے حملہ کیا، ادھر سے کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔ فرنگیوں نے محمد باغ پر قبضہ کر لیا۔ خیال کیا جاتا تھا کہ دوپہر تک وہ شہر میں داخل ہو جائیں گے جب وہ میدان دلکشا آپہنچے تو امجد علیخاں نے پانچ سو افراد کے ساتھ حملہ کیا۔ مولانا احمد اللہ شاہ اور احمد علی نے بھی دھاوا بولا مگر ناکامی ہوئی۔ مجاہدین نے شکوہ کیا کہ کارتوسوں میں بھوسی بھری ہے۔ معاملہ نواب ممّو خاں سے ہوتا ہوا بیگم حضرت محل تک پہنچا۔ مجاہدین نے نواب ممّو خاں پر فرنگی سازش کے شکار ہونے کا الزام لگایا بیگم حضرت محل نے بڑی مشکل سے جان بچائی اور کہا: تمہارا شبہ جس پر ہو اسے مار ڈالو۔ مجاہدین نے میر محمد علی اور ایک متصدی کو جو گراب بنواتا تھا، مشکیں باندھ کر سڑک پر لے جا کر مار ڈالا۔[2]

فرنگی ایک کے بعد ایک مقام پر قابض ہوتے رہے اور بڑھتے بڑھتے بیگم حضرت محل کی کوٹھی بادشاہ منزل واقع قیصر باغ تک آپہنچے۔ گھمسان کا رن پڑا، آٹھ نو گھنٹے تک گولہ باری ہوتی رہی۔ اس وقت تک فرنگی ہندوستان کے

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۶۷

[2] ایضاً ص ۲۸۱ - ۲۸۲

بیشتر حصوں پر قبضہ کر چکے تھے، اُن کے پاس جدید آلاتِ حرب کی کثرت تھی۔ حالات کے پیشِ نظر نواب ممّو خاں نے بیگم حضرت محل کو چوکھی چھوڑنے کی ترغیب دی لیکن اُن کے عزم و استقلال میں کوئی لغزش نہ آئی۔ ۱۲ مارچ کو اُن کی کوٹھی پر اور قیصر باغ کی درمیانی عمارت پر قبضہ ہوا۔ پھر امام باڑہ فتح ہُوا۔

شکست کے بعد بیگم حضرت محل چند روز لکھنؤ میں ہی رہیں اور جب فرنگیوں نے گرفتار کرنا چاہا تو ۱۶ مارچ ۱۸۵۸ء کو آپ نے محل کو خیرباد کہا۔ چوکھی سے روانگی کے منظر کی تصویر صاحبِ قیصر التواریخ نے یوں کھینچی ہے:

"حضرت محل بحال تباہ مع دیگر بیگمات و شاگرد پیشہ عورات اور ملازمین کے پھاٹک سے نکلیں۔ اس طرح کہ وہ آگے تھیں اور سب ان کے پیچھے صف بستہ برجیس قدر ایک انا کی گود میں تھے۔ پیادہ پائی کی وجہ سے ہر ہر قدم پر ٹھوکریں کھاتی اور گرتی تھیں۔ ٹیلہ شاہ پیر جلیل سے گزر کر پل مولوی گنج پر پہنچیں۔ تلنگے[1] ہر طرف متلاشی تھے۔ رات کو غلام رضا کے ہاں قیام کیا۔ پھر وہاں سے شرف الدولہ کے گھر گئیں اور وہاں سے محل سرائے حسین آباد گئیں۔ شام تک جتنا عملہ شاگرد پیشہ کا تھا، سب جمع ہو گیا اور ان کی حفاظت کو پہرے کھڑے تھے۔ علی رضا کے یہاں جنرل اولٹرم کا پیغام پہنچا کہ ہم زمانہ واجد علیشاہ کا بدستور تم کو تمہارا ملک دیں گے، جنگ سے دستبردار ہو جائیے۔ فوج مغلوبہ کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ حضرت محل نے اولٹرم کی بات نہ مانی۔"[2]

وُہ جانا پردہ نشینوں کا با سرِ عُریاں
وُہ دار و گیر سپاہِ شریر و بے ایماں

قیصر باغ کے بعد فرنگی محل، چوک اکبری دروازہ، نخاس، منصور نگر، کاظمین،

---

[1] دیسی سپاہ

[2] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۳۳۴

درگاہ حضرت عباس تک فرنگی فوج وائرس کی مثل پھیل گئی۔ تسخیر لکھنو کے بعد دہلی کی طرح ہی لوٹ کھسوٹ کی گئی، شاہی محلات کو لوٹا گیا۔ خواتین کے کانوں اور ہاتھوں سے زیورات نوچ لئے گئے۔ فرنگیوں نے ہزاروں کی تعداد میں مزدوروں اور بیلداروں کو پھاوڑے اور کدالوں سے اہم ترین عمارات مسمار کرنے کا حکم دیا۔ اس طرح دو تہائی شہر کو کھود کے پھینک دیا گیا۔ سپاہیوں نے کئی گوداموں کو توڑ کر رکھ دیا اور کھلی جگہ سامان جمع کیا جو صندوقوں، کشیدہ کاری کے کپڑوں، طلائی اور نقرئی زربفت، نقرئی ظروفوں، ہتھیاروں، جھنڈوں، ڈھولوں، شالوں، رومالوں، موسیقی کے آلات، آئینوں تصاویر، کتب، کھاتوں، ادویات کی بوتلوں، زرق برق پھریروں، ڈھالوں، نیزوں اور کئی چیزوں کے ڈھیروں سے اٹ گئی۔ جن کا شمار اس کاغذ کے ٹکڑے کو کسی دلال کی فروخت کی فہرست بنا دے گا۔ ان چیزوں میں انسانی جوش سے وحشی ہوتے ہوئے اور لوٹ سے مدہوش، پھرتے۔ ٹائمز کے نامہ نگار رسل کا یہ کہنا ہے کہ میں نے اکثر یہ فقرہ سنا تھا لیکن اس سے پہلے ہرگز دیکھا نہیں تھا۔ انھوں نے کھلی جگہ کے درمیان میں آگ میں زربفت اور کشیدہ کاری کی ہوئی شالیں جلائیں تاکہ سونا اور چاندی حاصل کر سکیں۔ چینی کے ظروف اور شیشے وغیرہ کو انہوں نے خالص چنچل پن میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تصاویر کو چاک کر دیا یا شعلوں کی نذر کر دیا۔ یہی حشر فرنیچر کا بھی ہوا[1]

اُدھر مجاہدین دریائے گومتی کے مشرقی کنارے کے نزدیک موسیٰ باغ نامی محل کے قریب جمع ہوئے۔ اُن کی تعداد سات آٹھ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اُن میں زیادہ تر پیادہ تھے۔ اُن کو شہر واپس لینے کی کوئی اُمید نہ تھی پھر بھی اُن کا حوصلہ بلند تھا۔ بیگم حضرت محل اور برجیس قدر محمود آباد کی راہ سے دریائے گھاگھرا عبور کر کے بونڈی پہنچے۔ مولانا احمد اللہ شاہ کی شہادت کے وقت دونوں یہیں چوک گھاٹ

---

[1] MY INDIAN MUTINY DIARY, P.103

میں تھے۔

نومبر ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ نے عام معافی کا اعلان کیا تو بیگم حضرت محل نے اس کے لئے ابطال کے لئے درج ذیل فرمان جاری کیا!

"ملکہ کے فرمان میں لکھا ہے کہ کمپنی نے جتنے معاہدے نوابوں اور راجاؤں سے کئے ہیں وہ منظور ہیں اور ان میں نئی کوئی بات نہیں۔ حالانکہ کمپنی نے راجہ بھرت پور کو بیٹا بنا لیا تھا اور پھر اس کا ملک ہتھیا لیا۔ لاہور کے سکھ سردار کو انگریز لندن لے گئے اور پھر وہ واپس نہ آیا۔ نواب شمس الدین خاں کو سلامتی کا وعدہ دے کر پھر پھانسی پر لٹکا دیا پیشوا کو پونا ستارا سے موقوف کر کے بتھور میں قید کر دیا۔ بنارس کے راجہ کو آگرے میں قید کر دیا۔ انہوں نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کے کسی راجہ یا نواب کا نام ونشان نہ چھوڑا۔ ہماری جائدادوں کو ضبط کر لیا اور زیادہ سے زیادہ گزارے کے لئے کچھ پیسے دے دیئے۔ فرمان کے ساتویں حکم میں لکھا ہے کہ اب وہ ہم سے کچھ چھینیں گے تو پہلی اور نئی حکومت میں فرق کیا ہے؟ اب چھیننے کے واسطے کیا رہ گیا ہے؟ انہوں نے بہانے اور الزام رکھ رکھ کر ہم سے کروڑوں روپے چھین لئے۔ انہوں نے واجد علی شاہ کو ملک سے محروم کر کے کیوں جلا وطن کر دیا؟ جب کہ ہم نے ان سے وفاداری اور تابعداری برتنے میں ذرا سی بھی کمی نہیں کی؛ ملکہ نے لکھا ہے کہ اب کسی حصے پر قبضہ نہ کیا جائے گا اور کوئی ملک حکومت نہ لے گی۔ اگر ایسا ہی ہے تو وہ بے خطا چھینے ہوئے ملک کیوں واپس نہیں کر دیتی جب کہ تمام رعایا کی یہی خواہش ہے۔؟

"تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا میں کسی بادشاہ نے بغاوت کے بدلے میں تمام فوج اور تمام رعایا کو تباہ نہیں کیا۔ ایسا ہی ہے تو سب کو عام معافی دے دینی چاہیئے جب تک فرمان میں سزا کا لفظ موجود ہے یہ ہنگامہ ہرگز نہیں دبے گا۔ یہ ایک مشہور ضرب المثل ہے کہ مرتا کیا نہ کرتا؛

"ملکہ کے اس فرمان میں لکھا ہے کہ جنہوں نے بغاوت کی یا دوسروں کو اکسایا ان کی جانیں بچ جائیں گی۔ البتہ جو لوگ قتل وغارت کے مرتکب ہوئے ہیں اُن پر کوئی رحم نہیں

کیا جائے گا۔

ایک بیوقوف آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ جب کوئی سزا سے نہیں بچ سکتا ہے تو ان شرائط میں کسی کو کیا توقع ہو سکتی ہے۔ صاف بات یہ ہے کہ ہماری فوجیں جہاں جہاں بھی موجود ہیں، ان علاقوں کے آدمیوں کو تباہ کر دیا جائے گا۔ انگریزوں نے کبھی کسی قصور وار کو معاف نہیں کیا۔ فرمان میں ہے کہ ہم تمہارے لیے سڑکیں اور نہریں بنائیں گے۔ کیا ہندوستانیوں کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے سوائے سڑکوں اور نہروں کے اور کوئی کام نہیں ہو سکتا۔"

اس طرح مجاہدینِ اودھ پر ملکہ وکٹوریہ کے اس اعلان کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ جون ۱۸۵۸ء سے لے کر اپریل ۱۸۵۹ء تک لڑتے رہے یہاں تک کہ فرنگیوں نے انہیں نیپال کی ترائی میں دھکیل دیا۔ یہ دونوں ماں بیٹا بھی جنوری ۱۸۵۹ء میں کٹھمنڈو جانے پر مجبور ہو گئے۔

مرزا رمضان علی ناکام	شد جانب کوہ چوں سبک تاز
تاریخ روانگی چو جستم	نیپال شناخت آور آواز

مولانا شرر رقمطراز ہیں:

"ہمراہ رکاب تقریباً ایک لاکھ کا مجمع تھا۔ ان لوگوں نے ارادہ کیا کہ ہمالیہ کی گھاٹیوں میں پناہ گزیں ہو جائیں اور جب موقع ملے نکل کے انگریزوں پر حملہ کریں فتح ہو تو اپنے وطن پہنچیں، شکست ہو تو پھر بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ لیں۔ ریاست نیپال نے مرزا برجیس قدر اور ان کی ماں کو تو پناہ دے دی مگر ان کے ہمراہی طوفان بے تمیزی کو حکم دے دیا کہ فوراً واپس جائیں۔ بہت سے بھاگ گئے، بہت سے مارے گئے، بہت سے بھیس بدل کر کسی طرف نکل گئے۔ مرزا برجیس قدر مع اپنی والدہ کے خاص نیپال میں جا کے سکونت پذیر ہو گئے۔ دربار نیپال سے ان کے لئے کچھ معمولی وظیفہ مقرر ہو گیا اور ان کے ساتھ جس قدر جواہرات تھے حکومتِ نیپال کے نذر ہو گئے۔"[1]

[1] گزشتہ لکھنؤ ص ۲۰

عرصہ تک فرنگیوں نے یہ خواہش بلکہ کوشش کی کہ بیگم حضرت محل ہندوستان واپس آجائیں۔ ایک انگریز مصور جو برجیس قدر کی تصویر کھینچنے کٹھمنڈو گیا تھا، اس کے ذریعہ بھی یہ پیغام بھیجا گیا کہ حکم سرکار ہے فیض آباد و لکھنؤ جہاں رہنا چاہیں، تنخواہ کے علاوہ احترام شاہانہ بھی کیا جائے گا[1] لیکن اس اولعزم ملکہ نے جلاوطنی کو ترجیح دی اور غاصبوں کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت کا خیال تک نہ کیا اور بالآخر اپریل ۱۸۷۹ء میں خالقِ حقیقی سے جا ملی۔

بیگم حضرت محل نے اپنے عزم کی بدولت تاریخ کے صفحات پر اپنا نام زندہ و جاوید چھوڑا۔ انہوں نے اُس خلا کو پورا کیا جو واجد علی شاہ کی کلکتے میں جلاوطنی سے پیدا ہو گیا تھا۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئی، بخت ہمایوں نے وہ یاوری کی کہ شاہ اودھ کی زوجیت کا شرف حاصل کیا۔ بچپن میں فتنہ تھی، جوانی میں قیامت بن گئی۔ صورت سحر طراز، انداز دل فریب، چتون میں شوخی، باتوں میں لگاوٹ، تبسّم جاں ستاں، عشوہ دشمن ایمان اور رہزن تمکیں، رقص میں برق، نغمہ سرائی میں طاق، غالبؔ کے اس شعر کی ہو بہو تصویر

ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

وُہ ساقی گلفام بھی تھی اور مطرب خوشنوا بھی۔ گھر میں صرف امراؤ تھی، واجد علیشاہ کے پری خانہ میں پہنچ کر مہک پری بن گئی۔ برجیس قدر کی پیدائش پر حضرت محل کا خطاب پایا، دو ہزار ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ تحریک آزادی کا آغاز ہوا تو اپنی غیر معمولی صلاحیتوں اور بے دار مغزی کے سبب انقلاب کی ایک عظیم قائد بنی۔ نہایت منتظم، خوددار، غیرت مند اور باتدبیر خاتون تھیں۔ سپاہیوں کی بے حسّی اور جمود کو توڑا اور خود ایثار و قربانی کی مثال پیش کی۔ بہادری اور جوش کا یہ حال تھا کہ باوجود پردے میں رہنے

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۳۶۸

کے گھوڑے پر کھیلتیں۔ تقریباً دس ماہ تک فرنگیوں کا مقابلہ کیا۔ حالانکہ اس سے قبل جب کبھی محل سے باہر نکلتیں تو چاؤشوں اور قلماقینوں کے نیزے آپ کے حجاب کی حفاظت کرتے تھے۔

بیگم حضرت محل کے انتقال کے بعد فرنگیوں نے ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر مرزا برجیس قدر کا "قصور" معاف کر دیا تو وہ کلکتہ پہنچے۔ اس وقت واجد علی شاہ کا انتقال ہو چکا تھا اور اکبر مرزا قمر قدر بہ حیثیت اولاد تنخواہ پا رہے تھے۔ مرزا برجیس قدر نے اپنے حق کے لئے نالش کی اور واجد علی شاہ کے تمام ورثاء کی خبرگیری کی حفاظت کے حق کا بھی مطالبہ کیا۔ مقدمے کی پیروی کے لئے انگلستان جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ ان کے خاندان والوں میں سے کسی نے دعوت کی۔ دعوت سے لوٹے تو قے و دست جاری ہو گئے۔ آناً فاناً حالت خراب ہو گئی اور ایک ہی دن میں وہ، ان کی اہلیہ اور کئی فرزند سب مالکِ حقیقی سے جا ملے۔



عظیم اللہ خان

جنگ آزادی کا نقشہ تیار کرنے والے اس عظیم مجاہد کو کان پور کی سرزمین نے جنم دیا۔ آپ کے والد کا نام عبداللہ خان تھا۔ اغلب یہی ہے کہ آپ کی ولادت ۱۸۲۰ء اور ۱۸۳۰ء کے درمیانی عشرے میں ہوئی ہوگی۔ کیونکہ ۱۸۵۳ء میں آپ کے سفر انگلستان کیوقت مختلف آراء کے مطابق آپ "جوان" تھے۔ آپ کے والدین علاقہ سرحد سے ہندوستان آئے تھے۔ ۱۸۳۷ - ۳۸ء کے قحط میں یا اس سے قبل آپ کے والد اس جہان فانی سے کوچ کر چکے تھے، صرف عظیم اللہ خان اور آپ کی والدہ باقی بچے۔ شیفرڈ کا بیان ہے کہ فاقہ کشی کی وجہ سے ان دونوں کی حالت نہایت خستہ ہو چکی تھی۔ ایسے موقع پر پادری نے تبدیلیٔ مذہب کی پیشکش کی لیکن اسلام کی اس شیدائی خاتون نے نہایت ناگواری سے اس "پیشکش" کو مسترد کر دیا۔ یتیم بچے کی گزراوقات کے لئے خود آیا یا خادمہ بن کر گزارہ کرتی رہی، بعد میں بچے کے لئے کان پور کے مشن کے فری اسکول میں داخلے کا بندوبست ہو گیا جہاں تین روپے ماہانہ وظیفہ ملنے لگا۔ مچل نے اپنی کتاب میں محمد علیخاں روہیل کھنڈی عرف جمی گرین کے حوالے سے لکھا ہے: میں نے (محمد علیخاں نے) اور عظیم اللہ خاں نے گورنمنٹ اسکول کان پور میں گنگا دھن سے انگریزی تعلیم پائی تھی اور بعد کامیابی عظیم اللہ ملازم اس اسکول میں ہوئے[۵] ایک روایت کے مطابق

---

۵ مقالہ: محمد علی عرف جمی گرین، رسالہ مصنف علی گڑھ مارچ ۱۹۴۳ء، غدر کے چند علماء ص ۱۰۳ - ۱۰۴

آپ کے معلم کا نام پیٹن تھا[1]

کچھ عرصہ معلم رہنے کے بعد آپ بریگیڈیر اسکاٹ کے ہاں منشی ہو گئے۔ اُس کے تبادلے کے بعد اُس کے جانشین بریگیڈیر ایلیٹن برنہم نے آپ پر مبینہ طور پر رشوت کا الزام لگا کر آپ کو برخاست کر دیا۔

مختلف مصنفین نے آپ کے مختلف پیشے اختیار کرنے کے متعلق لکھا ہے ساورکر کا خیال ہے کہ آپ نے ایک انگریز گھرانے میں بیرے کے فرائض بھی انجام دیئے[2] آپ ایک اینگلو انڈین خاندان میں خدمت گار یا پیادہ بھی رہے[3] عظیم اللہ خان نے مشکلات اور موانع کے باوجود انگریزی اور فرانسیسی میں کامل واقفیت حاصل کر لی۔ ایسا آپ کی اخذ و فہم کی خاص صلاحیت کے باعث ہوا ہوگا۔ دُور تک آپ کی زبان دانی اور قابلیت کی شہرت پھیل گئی۔ جو گورنر بھی کان پور آتا، آپ ہی اس کا سپاسنامہ تحریر کرتے۔ اس طرح ضلعی انتظامیہ میں آپ کا اثر و رسوخ بڑھ گیا کلکٹر کان پور نے نانا رئیس بٹھور، باجی راؤ کا لے پالک لڑکا، سے آپ کی اعلیٰ قابلیت کا ذکر کیا تو اُس نے آپ کے ساتھ پہلی ہی ملاقات کے بعد آپ کو اپنا مشیر مقرر کر دیا۔ وہ آپ کی کارکردگی سے ایسا خوش ہوا کہ آپ کے بغیر کوئی کام ہی نہیں کرتا تھا۔ اس طرح آپ علاقے کی دوسری اہم شخصیت بن گئے۔

فرنگیوں نے نانا راؤ کی پنشن بند کی تو یہاں ناکام کوششوں کے بعد اُس نے عظیم اللہ خان کو اپنے مقدّمے کا مختار بنا کر لندن بھیجا تاکہ وہاں دادرسی کی جا سکے۔ محمد علی خان روہیل کھنڈی کے علاوہ نانا راؤ کا بھائی بال راؤ بھی ساتھ تھے لندن میں آپ کے دلاویز پیکر نے وہاں کی سوسائٹی میں ہلچل پیدا کر دی۔ آپ

---

[1] ۱۸۵۷ء، مولانا غلام رسول مہر، ص ۷۷

[2] ساورکر ص ۲۸ بحوالہ ۱۸۵۷ء، مولانا غلام رسول مہر ص ۷۸، غدر کے چند علماء ص ۱۰۳۔

[3] G.O. TREVELYAN, CAWNPORE, (LONDON AND CAMBRIDGE, 1865) P.44.

اپنی سحر طراز گفتگو، باوقار انداز اور حسن لیاقت کے سبب سب کی نظروں کا محور بن گئے۔ اخبارات میں انہیں پرنس آف انڈیا لکھا جاتا تھا۔ اپنی خوبیوں اور مردانہ حسن کے باعث اُمراء کی صاحبزادیاں آپ کی متوالیاں بن گئیں۔ عظیم اللہ خان ان کے عاشقانہ خطوط کا جواب محض لطف اندوزی کے لئے دیتے مگر اپنا دامن آلودہ نہ ہونے دیا۔ ان لگاوٹوں کی تصدیق اُن خطوط سے ہوئی جو بٹھاور تا کی تباہی کے وقت ہیولاک کے ہاتھ لگے۔ ادھر عورتوں کا یہ حال تھا تو دوسری طرف کمپنی کے ڈائریکٹروں نے آپ کی میٹھی اور رسیلی استدعاؤں پر ذرا دھیان نہ دھرا۔ سخت مایوسی ہوئی لیکن لندن کے قیام کے دوران میں آپ نے فرنگیوں کے مزاج کا بخوبی مطالعہ کیا اور جنگِ آزادی کے ضمن میں فرنگیوں کی سیاست اور ان کی مجبوریوں کا اندازہ لگاتے رہے۔ بعض روایتوں کے مطابق ستارا کی گدّی سے ہٹائے جانے والے راجہ کی اپیل لے کر رنگو باپوجی بھی لندن پہنچے، وہ بھی اپیل منظور نہ کرا سکے لندن ہی میں اُن کی ملاقات عظیم اللہ خاں سے ہوئی اور دونوں حریت پسندوں نے جنگِ آزادی کے بارے میں باہمی صلاح مشورہ کیا۔ رنگو باپوجی جنوبی ہند میں تحریک منظم کرنے کے لئے واپس وطن پہنچ گئے جب کہ عظیم اللہ خان نے فرانس کا رُخ کیا جہاں سے آپ قسطنطنیہ آئے۔ یہ سلطان عبدالعزیز کا زمانہ تھا۔ آپ نے وہاں اُمراء اور اربابِ حکومت سے ملاقاتیں کیں۔ لارڈ رابرٹس کے مطابق آپ نے عمر پاشا کو دو خطوط لکھے جو کریمیا میں تُرک جرنیل کی حیثیت سے لڑ رہے تھے۔ ان خطوط میں ہندوستان کے سپاہیوں کی بے چینی اور ہندوستان کی عام سیاسی ابتری کا حال بیان کیا گیا تھا۔[1]

اب عظیم اللہ خاں نے کریمیا کا رُخ کیا۔ ان دنوں جنگِ کریمیا ہو رہی تھی۔

---

[1] سادرکر ص ۶۰ - ۶۱ - بحوالہ ۱۸۵۷ء، غلام رسول مہر ص ۴۸ -

وہاں آپ ٹائمزِ کے نامہ نگار رسل[1] کے خیمہ میں فروکش تھے۔ سٹاپول جو میدانِ جنگ بنا ہوُا تھا اور جہاں سے رسل، اُمرائے رُوس اور عظیم اللہ خاں جنگ کا نقشہ دیکھ رہے تھے، اتفاقاً ایک گولہ وہاں آکر گرا۔ سب لوگ بھاگے لیکن عظیم اللہ خاں وہاں سکون سے بیٹھے رہے۔ گرد و غبار چھٹنے کے بعد سب کا خیال تھا کہ آپ مُردہ حالت میں ہوں گے۔ سب انگشت بدنداں رہ گئے کہ آپ اطمینان سے گرد و غبار جھاڑ رہے تھے۔ رسل نے نہ بھاگنے کی وجہ پوچھی تو عظیم اللہ خاں نے جواب دیا کہ میں بزدل نہ تھا۔ اگر میری موت واقع ہونی تھی تو مجھے کون بچا سکتا تھا۔ رُوسیوں پر آپ کے استقلال طبیعت کا گہرا اثر ہوُا۔ آپ نے اپنی ملاقات کے دوران میں اُن کو آمادہ کیا کہ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف قدم اٹھائیں۔ بعض کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ جنگ آزادی کے ابتدائی دنوں میں عام تاثر یہ تھا کہ عظیم اللہ خاں کے توسط سے نانا راؤ اور رُوس کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ بھی طے پایا۔ جنگ کریمیا کا مطالعہ بھی آپ کے آئندہ کے منصوبوں کا پتہ دیتا ہے۔

یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ عظیم اللہ خان نے اٹلی کی آزادی کے مشہور مجاہد گیری بالڈی سے بھی ملاقات کی تھی جس نے مجاہدین کی اس حد تک مدد کے لئے تیاریاں کر لی تھیں کہ بعض جہازوں پر ہتھیار لاد دیئے تھے لیکن یہ جہاز تحریک کے بہت جلد ختم ہونے کے باعث روانہ نہ ہوسکے۔[2]

لندن سے ناکام واپسی پر عظیم اللہ خاں نے نانا راؤ کو تحریکِ آزادی میں شامل ہونے پر آمادہ کیا جو خفیہ طریقے سے منظم کی جا رہی تھی۔ عظیم اللہ خاں نے جنگ آزادی کا ایک جامع نقشہ تیار کیا جس کے مطابق بہادر شاہ ظفر کے نام پر ایک

---

[1] رسل بعد میں ہندوستان آیا، جنگ آزادی دیکھی اور
کے نام سے ایک کتاب بھی رقم کی۔

[2] سن ستاون، پنڈت سندر لال، ص ۵۳، علی گڑھ، ۱۹۵۷ء۔

ہی روز ہندوستان بھر میں علمِ آزادی بلند ہونا تھا۔ اس ضمن میں انتہائی راز داری کا اہتمام کیا گیا۔ چونکہ چھوٹے چھوٹے والیانِ ریاست فرنگیوں کا رُعب داب تھا اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ نانا راؤ اور عظیم اللہ خان جاترا کے نام سے تمام ہند کا دورہ کریں۔ چنانچہ اس قافلہ میں نانا راؤ کی دخترِ مینا بائی، تانتیا ٹوپے اور اس کا باپ سری پانڈو رنگ راؤ بھٹ بھی شامل تھے۔ دہلی، لکھنؤ اور پونا وغیرہ میں تحریک کا بگل بجانے کے انتظامات مکمل ہو گئے۔ اودھ میں واجد علیشاہ کی معزولی کے باعث بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ یہی وہ دن تھے جب مولانا احمد اللہ شاہ نے لکھنؤ کا سفر اختیار کیا، راستے میں عظیم اللہ خاں سے ملاقات ہوئی اور اُن سے مستقبل کے لائحہ عمل پر بحث ہوئی۔ مولانا کانپور کے حالات پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے۔ اس طرح عظیم اللہ خاں اور مولانا احمد اللہ شاہ کے درمیان رابطہ موجود تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ رابطہ عظیم اللہ خاں کے لندن فرانس، کریمیا اور ترکی کے دورے سے قبل ہی قائم ہو گیا تھا۔

ان انتظامات کے تحت عظیم اللہ خاں نے نانا راؤ کی معیت میں دہلی کے لال قلعہ میں بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ملاقات کی اور جنگِ آزادی کے بعض پہلوؤں پر تبادلہ خیالات کیا اور آخری مراحل کی تفصیلات طے کیں۔ وقت مقررہ سے پہلے عظیم اللہ خان نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے تمام انگریز چھاؤنیوں کی تفصیلات حاصل کیں اور تحریک کو منظم کرنے کے بعد اقدامات کرنے کے بعد ۷ جون ۱۸۵۷ء کو جہاد کا علم بلند کیا۔ یہ خدمت سب سے پہلے عظیم اللہ خان نے انجام دی۔ بٹھور میں نانا راؤ کو گدی نشین کرکے مہاراجہ کا خطاب دیا گیا اور عظیم اللہ خاں کو وائسرائے مقرر کیا۔

کان پور الہ آباد ڈویژن کا ایک ضلع تھا، چمڑے کے کاروبار کے لئے مشہور تھا۔ یہاں انگریزوں کی قائم کردہ چھاؤنی کے سپاہیوں کے علاوہ بہت سے انگریز تاجر، سیاح اور مشنری بھی موجود تھے ۱۸۵۷ء میں یہاں کے ڈویژن کا جو کمانڈنگ افسر سر ہگ وہیلر تھا۔ جب ہر طرف شورش پھیل گئی تو وہیلر نے بارکوں

میں دریا کے کنارے سے ہٹ کر ایک جگہ منتخب کی تاکہ وہاں استحکامات کر لئے جائیں۔ رسد بھی جمع کر لی گئی اور توپیں نصب کر دی گئیں۔ انہی تیاریوں کو دیکھ کر عظیم اللہ خاں نے اپنے ایک انگریز دوست سے پوچھا تھا کہ اس مقام کا نام کیا رکھو گے؟ تو اُس نے جواب دیا "حصارِ امید"، تو عظیم اللہ خاں نے اُسے "حصارِ یاس" قرار دیا تھا۔[1]

انگریزوں کا محاصرہ ۲ جون سے ۲۷ جون تک جاری رہا، بالآخر انگریزوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ حوالگی کی شرائط کے مطابق اُن کو بہ خیریت الہ آباد پہنچانا تھا، البتہ لارڈ ڈلہوزی کے اعمال سے تعلق رکھنے والوں کو معافی نہ دی گئی۔ ۲۷ جون کو صبح کے وقت تمام انگریزوں کو کرستی چوڑا گھاٹ پر پہنچایا گیا جہاں کشتیاں ٹھہرائی گئی تھیں۔ یہاں نانا راؤ، تانتیا ٹوپی، عظیم اللہ خاں، بالا راؤ اور جوالا پرشاد موقع پر موجود تھے۔ عین روانگی کے وقت کشتیوں پر آتش باری شروع ہوگئی۔ کچھ فرنگی ڈوب گئے، کچھ اسیر ہوئے۔ صرف ایک کشتی بچ نکلی۔ ان متذکرہ اصحاب میں سے کوئی بھی اس حملے کے حکم دینے کا ذمہ دار نہیں تھا۔ جیسا کہ عام طور پر تانتیا ٹوپی یا نانا راؤ کے متعلق خیال کیا جاتا ہے۔

دراصل سپاہی کرنل نیل کے بے حد مظالم کی وجہ سے اس کارروائی کے مرتکب ہوئے تھے۔ عظیم اللہ خاں نے اس اقدام کو پسند نہ کیا اور نانا راؤ کو چھوڑ کر لکھنؤ مولانا احمد اللہ شاہ آ گئے۔ آپ کے چلے جانے کے بعد نانا راؤ عیش و عشرت میں مشغول ہوگیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد انگریزوں نے اُسے شکست دیدی۔

لکھنؤ میں عظیم اللہ خان نے معرکہ بیلی گارد میں شمولیت کی، آپ کا بھی ایک دبدبہ تھا۔ آپ مولانا احمد اللہ شاہ کے ساتھ شاہ جہان پور تک رہے اور پھر

---

[1] ۱۸۵۷ء، غلام رسول مہر، ص ۳۰۸ - ۳۰۹

نیپال چلے گئے جہاں ۱۸۵۹ء میں رحلت فرمائی۔

عظیم اللہ خاں ایک زوال آشنا قوم کے فرد تھے جو شعلۂ مستعجل کی طرح چمکا اور نمود دکھا کر راکھ بن گیا۔ اگر آپ کو بلند عزائم اور بلند ہمت ساتھی میسر آتے تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ فضا آپ کی حمایت میں نہ ہو جاتی اور ہندوستان کی تاریخ کسی اور انداز سے لکھی جاتی۔

مولانا احمد اللہ شاہ

آپ کا اصلی نام سیّد احمد علی خان تھا۔ حُریّت پسندوں کی اُمیدوں کا یہ روشن آفتاب صوبہ مدارس کے شہر چیناپٹن کے اُفق پر ۱۸۱۷ء میں اُس وقت طلوع ہُوا جبکہ سلطان فتح علی (سلطان ٹیپو) کے خون کے نشان ابھی جنوبی ہند کے در و دیوار پر موجود تھے۔ مولانا کی رگوں میں تاجدارانِ گولکنڈہ کا خون موجزن تھا۔ مُفتی انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی کی تحقیق کے مطابق آپ گولکنڈہ کی قطب شاہی حکومت کے آخری تاجدار ابوالحسن عرف تانا شاہ کے پڑپوتے تھے۔ آپ کے بزرگ سلطان حیدر علی اور سلطان فتح علی کے دربار میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ چیناپٹن میں آپ دلاور جنگ نواب احمد علی شاہ کہلاتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ ضیاء الدین کے نام سے بھی پہچانے جاتے تھے[1]

بچپن میں آپ کو حدیث، تفسیر، عربی اور فارسی کے علاوہ سپہ گری کی بھی تعلیم دی گئی اور یہ دونوں خصوصیات آپ کی عمر بھر ممتاز رہیں۔ سنِ تمیز کو پہنچے تو علمِ سینہ اور علمِ سفینہ کے ماہر ہو چکے تھے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ آپ نے انگریزی کب سیکھی لیکن جب آپ اودھ میں تھے تو آپ اس زبان سے واقف ہو چکے تھے[2] سولہ برس کی عمر میں آپ حیدر آباد گئے۔ آپ نے نظام دکن کی

---

[1] تواریخ احمدی، فتح محمد طیب، ص ۲۸۔ لکھنؤ۔

[2] G. HUTCHINSON, NARRATIVES OF THE MUTINIES IN QUDH, CALCUTTA, 1859, P.33–37

حمایت میں مرہٹوں سے لڑکر انہیں شکست دی ۔ اس صلہ میں آپ کو ریاست کی طرف سے ایک بڑا عہدہ ملتا تھا مگر آپ نے قبول نہ کیا۔[1] خاندانی حسب ونسب کی بنا پر آپ کی شادی نظام کے خاندان میں ہونے کی تجویز تھی لیکن بوجوہ نہ ہو سکی ۔ بہر حال شادی حیدر آباد ہی میں ہوئی لیکن رفیقۂ حیات نے جلد ہی داغ مفارقت کہہ کر دائمی اجل کو لبیک کہا ۔ آپ کا دل دکن سے اُچاٹ ہو گیا تو آپ نے انگلستان کا رختِ سفر باندھا جہاں ملکہ وکٹوریہ نے آپ کو شرف باریابی بخشا ۔ واپسی پر آپ نے قسطنطنیہ ، ایران اور افغانستان کی سیاحت کے علاوہ بیت اللہ کا حج بھی کیا ۔ ایران میں ملازمت کی پیشکش ہوئی لیکن قبول نہ کی ۔

وطن واپس آکر تصوّف کا شوق چرایا ، اسی لئے دہلی کا سفر کیا لیکن پیاس نہ بجھی پھر راجپوتانہ کے ریگ زاروں میں جا پہنچے اور سن بہار کے مقام پر قربان علی نامی ایک صوفی کے آگے شرف تلمذ تہ کیا ۔ انہوں نے آپ کا نام احمد اللہ شاہ رکھا ، خلافت عطا کی اور دورہ کرنے کی ہدایت کی ۔ آپ نے حکم کی تعمیل کی لیکن روح کو چین نصیب نہ ہوا ۔ والدین کے پاس جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ دوبارہ گوالیار جانے کا کشف ہوا ۔ وہاں قادریہ سلسلے کے بزرگ محراب شاہ کی نظر کیمیا نے رنگ اور چوکھا کر دیا ۔ خود محراب شاہ پر جہاد کا رنگ غالب تھا ۔ مولانا نے روحانی عظمت کو مستور کرنے اور انکساری میں ڈوبنے کے لئے ایک معزز آدمی کے ہاں پیادے کی حیثیت میں ساڑھے چار برس ملازمت کی ۔ تربیت مکمل ہونے پر مرشد نے خلافت عطا کی ۔

حالات کا جائزہ لینے سے پہلے آپ دہلی گئے لیکن نا مساعد حالات کی بنا پر مفتی صدر الدین آزردہ کے ایماء پر آگرہ کو مسکن بنایا ۔ جلد ہی مقبول عام ہو گئے ۔ یہاں آپ نے مجلس العلماء قائم کی ۔ آپ کی محبوبیت اور مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ آپ کی مجلسِ وعظ میں دس دس ہزار افراد کا مجمع ہوتا تھا[2] مہینے میں آٹھ دفعہ تبلیغی جلوس

---

[1] مسلمانوں کا شاندار مستقبل ص ۹۲

[2] گزشتہ لکھنؤ ، عبدالحلیم شرر ، ص ۴۴

نکالتے جس کے ہراول پر نقارہ بجتا۔ یہیں سے آپ ڈنکا شاہ کے نام سے مشہور ہوئے۔
جب آپ نے محسوس کیا کہ حکومت کا رویہ مشکوک ہے تو شہر چھوڑ دیا۔
وہاں ویسے بھی آپ کا مشن مکمل ہو چکا تھا۔ آپ کے آگرہ چھوڑنے کے بعد حکومت نے آپ کے کچھ رفقاء کو پکڑ کر آپ پر تشدد کیا لیکن آپ کے خلاف کچھ ثابت نہ ہو سکا۔ اب مولانا نے برملا انگریز دشمنی کا اظہار کرنا شروع کر دیا اس لئے کئی مقامات کا دامن آپ پر تنگ ہوا۔ آپ نے کلکتہ، میرٹھ اور پٹنہ کا وسیع دورہ کیا۔ علی گڑھ میں آپ نے بیشمار پیروکار جمع کئے اور پیشین گوئی کی کہ چھ ماہ کے اندر اندر انگریزوں کے ساتھ ایک مسلح تصادم ہو گا[1] جب آپ نے ہنومان ٹیکری صوبہ اودھ میں امیر علی شاہ کی شہادت کی خبر سنی تو آپ اُن کا بدلہ لینے کے لئے لکھنؤ اُٹھ آئے۔ راستے میں آپ کی ملاقات عظیم اللہ خان سے ہوئی اور اُن سے مستقبل کے منصوبے پر گفتگو ہوئی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا احمد اللہ شاہ اور عظیم اللہ خاں کے درمیان موخرالذکر کے یورپ کے سفر سے پہلے ہی رابطہ قائم ہو چکا تھا۔
لکھنؤ میں شروع شروع میں آپ کا قیام گھسیاری منڈی میں تھا۔ یہ زمانہ واجد علی شاہ کی جلاوطنی کا تھا۔ حالات کی سازگاری نے آپ کو آنکھوں پر بٹھا لیا۔ انبوہ عظیم نے آپ کو گھیر لیا، ان میں دلیسی سپاہی بھی شامل تھے۔ خفیہ خط و کتابت بھی آپ کے ذرائع میں شامل تھی۔ بالآخر سی آئی ڈی کے گماشتوں نے آپ کی تنظیم کو طشت از بام کر دیا۔ آپ فیض آباد اُٹھ آئے۔ یہاں آپ کے پیروکاروں نے پریڈ اور مارچ پاسٹ کی شکل میں فوجی تربیت حاصل کرنا شروع کر دی[2] مقامی انتظامیہ نے کسی بھی خطرے کے پیشِ نظر فوج کی امداد طلب کرنے کے بعد آپ کو اپنی سرگرمیاں

---

[1] THE GREAT REVOLUTION OF 1857.
SYED MOINUL HAQ. KARACHI, 1968, P.60

[2] ۱۸۵۷ء کے مجاہد، غلام رسول مہر، ص ۶۹

بند کرنے کی تلقین کی کیونکہ پولیس نے ان پر ہاتھ ڈالنے سے انکار کر دیا تھا جب آپ کو حراست میں لینے کی کوشش کی گئی تو آپ نے اور آپ کے مُریدوں نے مسلح مزاحمت کی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ آتشیں ہتھیاروں کے ساتھ نہ لڑے اور آسانی سے اُن پر غلبہ پا لیا گیا[1] گرفتار ہو کر فیض آباد جیل پہنچے۔ پس زنداں میں بھی آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ منقطع نہ کیا۔ مقدمہ چلا اور مولانا کو سزائے موت سُنائی گئی۔ ابھی سزا پر عملدرآمد نہیں ہُوا تھا کہ سپاہیوں اور عوام نے جیل پر یلغار کر کے آپ کو رہا کرا لیا۔ پیادہ صوبے دار دلیپ سنگھ نے فوج لے جا کر تمام انگریز افسروں کو قید کر لیا۔ اس وقت تحریک آزادی کا آغاز ہو چکا تھا ۷ جُون کو سیتاپور میں علَمِ جہاد بلند ہوا۔ اگلے روز فیض آباد کے فوجیوں نے بھی اُس میں شرکت کا اعلان کر دیا۔ جیل سے رہا ہو کر آپ نے لکھنؤ میں تارے والے کوٹھی میں سکونت اختیار کی اور اسی میں اپنا دربار قائم کیا۔ مجاہدین کے افسر یہیں جمع ہو کر مشورے کیا کرتے تھے[2] مولانا نے شہر اور علاقے میں امن و امان قائم کیا۔ ہر جگہ پہرے بٹھا دیئے گئے۔ انگریز دشمنی کے باوجود آپ نے انگریزوں کے ساتھ معاندانہ رویہ نہ برتا بلکہ انہیں کچھ سامانِ رسد اور نقد روپیہ دے کر کشتیوں میں سوار کر کے دریائے گھاگرا کے پار بھیج دیا۔ بدقسمتی سے ۱۷ویں رجمنٹ کے سپاہیوں نے انہیں دیکھ لیا اور حملہ کر دیا۔ اس طرح چیف کمشنر گولڈنی، لیفٹیننٹ تھامس، رچی، مِل، ایڈورڈز اور کری وغیرہ قتل کر دیئے گئے لیکن ایک کشتی بچ کر منزل پر پہنچ گئی۔

۱۰ جُون کو ہندو سپاہیوں نے راجہ مان سنگھ کو اپنا سردار منتخب کرنے کا اعلان کر دیا۔ کیونکہ مولانا نے ایک قدیم مسجد کی مسلمانوں کو واگذاری کا حکم دیا تھا جسے

---

[1] طلسم، لکھنؤ، ۷ مارچ ۱۸۵۷ء

[2] گزشتہ لکھنؤ، عبدالحلیم شررؔ، ص ۴۴۔

ایک مندر میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

فیض آباد کے ساتھ دریا آباد اور ۹ جون کو سلطان پور کے قصبات نے بھی جہاد کا اعلان کر دیا۔ سلطان پور میں پندرہویں بے قاعدہ گھوڑ سوار فوج تعینات تھی، کرنل فشر جو رجمنٹ کا کمانڈر تھا، ہلاک کر دیا گیا۔ اب مجاہدین نے لکھنؤ کا رُخ کیا۔ اگلے دو روز میں بھارپچ اور گونڈا بھی انقلاب میں شامل ہو گئے۔ دریں اثنا پڑوسی اضلاع اعظم گڑھ بنارس، الہ آباد اور گورکھ پور بھی کمربستہ ہو چکے تھے۔

دوسری طرف فرنگیوں نے ریذیڈنسی کی قلعہ بندی کی اور مناسب مقامات پر توپیں نصب کر دیں[1] ریذیڈنسی چیف کمشنر کی تین منزلہ سرکاری رہائش گاہ تھی۔ اس کے اردگرد خندقیں تھیں اور عمارات کا کل رقبہ ۶۰ ایکڑ تھا۔ یہ ایک سطح مرتفع پر واقع تھی۔ اس کے بائیں طرف بیلی گارد گیٹ تھا۔

مولانا احمد اللہ شاہ نے اس دوران میں نواب گنج میں ڈیرہ لگایا.... بعد میں چنہٹ کے مقام پر فرنگی فوج کو شکست دی۔ اگرچہ آپ زخمی تھے لیکن لکھنؤ تک اس کا تعاقب کیا۔ یہاں سے ریذیڈنسی کا محاصرہ شروع ہوا۔ اس کے تین ہفتوں بعد مجاہدین نے خندقوں کے اندر کی مختلف عمارات پر گولہ باری جاری رکھی۔ ۲۰ جولائی کو عام حملہ کیا گیا۔ مجاہدین عزمِ مصمم کے ساتھ گولیوں کی بوچھاڑ میں آگے بڑھتے رہے۔ اِنز کی چوکی پر حملہ زیادہ طویل اور ثابت قدم تھا کہ ایک دفعہ تو پوسٹ کا عقب سے رابطہ منقطع ہونے کا خطرہ نظر آیا۔ مجاہدین کا گرجے کے پہلو کی طرف دباؤ بڑھ رہا تھا... لہٰذا وہ .... اچھی خاصی بہادرانہ کوشش کے بعد بے سوچے سمجھے واپس چلے گئے۔ اُن میں سے کچھ جو رکاوٹوں تک چلے بھی گئے تھے وہ درختوں

---

[1] M.A. GUBBINS, AN ACCOUNT OF THE MUTINIES IN QUDH AND THE SIEGE OF THE LUCKNOW RESIDENCY, LONDON 1859, P.153–164

[illegible] کا تھا۔ اُن
[illegible]

[illegible] وہ سمجھے کہ باغی واپس چلے گئے تھے
[illegible]
[illegible] وقت [illegible] جب [illegible] سے
[illegible]

[illegible] رہے تھے۔ ۲۰ جولائی کو ہیولاک
نے [illegible] جولائی [illegible] تک [illegible]۔
[illegible] بریگیڈیئر [illegible] کی طرف سے [illegible]
[illegible] جولائی [illegible] پر
[illegible] سے [illegible] لکھنؤ تک پہنچنے
سے [illegible] آ گئے۔ [illegible] نے [illegible] اگست کو بریگیڈیئر [illegible] کے قریب
[illegible] ۶ فٹ نیچے کھینچی۔ [illegible] اگست کو انقلابی
[illegible] کامیاب ہو گئے۔ ۵ ستمبر کو باغیوں نے میرا پر حملہ کیا۔
[illegible] کے حالات کا جائزہ جنرل [illegible] کے اس خط سے ہو سکتا ہے
[illegible] نے [illegible] ہیولاک کو لکھا۔ اس نے کہا: "اگر تمہیں اس فوج کو بچانے
کی امید ہے تو آگے بڑھنے میں بالکل وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ دشمن ہم پر
[illegible] حملہ کرتا ہے اور ہمارے دفاعات سے چند ہی گزوں کے فاصلے پر ہے
ان کی سرنگوں نے ہماری پوسٹ کو پہلے ہی کمزور کر دیا ہے اور مجھے مکمل یقین ہے
کہ وہ دوسری پوسٹوں پر بھی قبضہ کر لیں گے۔ اُن کی اٹھارہ پونڈ کا گولہ پھینکنے والی

MCLEOD INNES. LUCKNOW AND OUDH IN THE MUTINY. LONDON 1896. P.125

توپیں ہماری بعض توپوں سے ۵۰ اگز کے فاصلہ پر ہیں۔ اُن کی پوزلیشن اور ہماری کام کرنے والی جماعتوں کی تشکیل کرنے کی نااہلیت کی وجہ سے ہم اُن پر جوابی حملہ نہیں کر سکتے۔ نتیجۃً ہر گھنٹہ ہونے والا نقصان بہت زیادہ ہے ... ہماری دیسی افواج جسے کوئی ۲۵ روز قبل تمہاری قرین آمد کا یقین دلایا گیا تھا... فطری طور پر اعتماد کھو رہی ہیں۔ اور اگر وہ ہمیں چھوڑ جائیں تو میں نہیں سمجھتا کہ دفاعات کا انتظام کیسے ہوگا؟"[1]

مجاہدین نے بار بار قلعہ پر حملہ کیا اور محصورین کا ناک میں دم کر دیا۔ وہ بار بار کانپور سے امداد طلب کرتے۔ ۱۹ ستمبر کو اوٹرم اور ہیولاک دونوں کمک لے کر لکھنؤ آ رہے تھے کہ شہر سے چار میل باہر عالم باغ کے نزدیک مجاہدین نے ان کا راستہ روک لیا۔

۲۲ ستمبر کو مولانا یکہ وتنہا ہی موتی محل گئے اور ایک گورے کا سر کاٹ لیا اور جوش میں آکر یہ شعر پڑھا۔

چوں شود در عہد ایناں جور و بدعت را رواج
شاہ غزنی بہر قتلش فوش عناں پیدا شود
درمیان ایں و آں گرد دبیسے جنگ عظیم
قوم عیسٰی را شکستِ بے گماں پیدا شود

یعنی "وہ شاہ غزنی میں ہوں، میرا کوئی ہمسر نہیں، بر جبیں قدر کیا ہے، شاہِ ولی میرے رتبہ سے کم ہے۔ مجھ کو حکم اللہ ہے۔ میرے ہاتھ یہ فرقہ نصاریٰ تباہ ہوگا۔ میں ظلِ اللہ، خلیفۃ اللہ فی الارض ہوں"[2]

۲۳ ستمبر کو لڑائی ہوئی اور انگریزوں نے عالم باغ پر قبضہ کر لیا۔ عیش باغ کے بعد سکندر باغ پر لڑائی ہوئی۔ اگرچہ نیل مارا گیا لیکن ۲۵ ستمبر کو انگریز ریذیڈنسی

---

[1] ایضاً ص ۱۴۸

[2] قیصر التواریخ ص ۲۷۱ - ۲۷۲

کیمبل نے ۲۸ فروری کو کان پور چھوڑا۔ اُس کی فوج میں انفنٹری کی ۱۰ توپیں، رسالے کے ۲۸ اسکوڈرن اور ۱۳۴ توپیں تھیں۔ اس فوج نے دریائے گومتی کے کنارے واقع دلکشا نامی قدیم محل پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں اس فوج نے شہر کے اندر بڑی بڑی عمارات پر گولہ باری شروع کر دی مولانا نے سخت مزاحمت کی لیکن ۱۱ مارچ کو اوٹرم آہنی پل پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ انگریز لکھنؤ کے ایک ایک مقام پر قابض ہوتے رہے۔ ۱۱ مارچ کو ہڈسن واصل جہنم ہوا جس نے دہلی میں مغل شہزادوں کا قتل کیا تھا۔ شکست کے آثار دیکھ کر ۱۶ مارچ کو بیگم حضرت محل نے برجیس قدر، دیگر بیگمات اور ملازمین کی معیت میں محل کو الوداع کہا اور بوندی کی راہ لی۔ مولانا نے مزید مزاحمت کی لیکن بالآخر آپ کو بھی ۲۱ مارچ ۱۸۵۸ء کو پسپا ہونا پڑا۔ لکھنؤ مسخر ہو گیا تھا۔

یکم اپریل تک فرنگی فوج کی تعداد چھیانوے ہزار تک پہنچ گئی۔ اس میں سکھ، پٹھان اور پنجابی مسلمان بھرتی ہو چکے تھے۔ نیپال سے جنگ بہادر پانچ ہزار گورکھے لے کر لکھنؤ پہنچ گیا تھا۔ اب مولانا نے بارلی میں پڑاؤ کیا اور گوریلا جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ ذیل کا اعلان ہر طرف بھیجا:

"انگریزوں کو باقاعدہ فوجوں کا مقابلہ کھلے میدان میں ہرگز نہ کرو۔ ان کے انتقام کا مقابلہ مشکل ہے۔ تمہارے پاس ان کی سی بندوقیں ہیں، نہ دوسرے سامانِ جنگ ہیں۔ اس لئے ان کی نقل و حرکت کی ٹوہ لگاؤ۔ دریاؤں کے گھاٹ روک لو، اُن کے وسائل آمد و رفت کو کاٹ دو، رسد و سامان کا سلسلہ توڑ دو۔ ڈاک بند کر دو اور ان کے کیمپ کے قریب لگ کر انہیں آرام نہ لینے دو۔"

مولانا نے فرنگی کیمپ کی خبریں حاصل کیں پھر کچھ فوج بھیج کر ایک گاؤں پر قبضہ کر لیا جو بارلی سے چار میل کے فاصلے پر تھا۔ میلی سن لکھتا ہے۔

"یہ نہایت ہی اچھوتا خیال تھا اور مولوی کی فوجی قابلیت کا بہترین ثبوت اس شاندار کامیابی کے لئے مکمل رازداری کی ضرورت تھی اور دوسرے یہ کہ سوارعین اس وقت حملہ کریں جب سامنے کی فوج حملہ آور ہو۔ سوار اسی رات، گاؤں کی طرف روانہ کر دیئے اور خود گاؤں میں چھپ کر بیٹھ رہا یہ کام اتنی پھرتی اور چالاکی سے کیا کہ انگریز جنرل کو بالکل پتہ نہ چلا۔ انگریز جنرل بڑھتا چلا گیا۔ صرف آدھ گھنٹے کی دیر تھی، یقینی طور پر انگریزی فوج کا صفایا ہو جاتا۔ سوار بہت، اچھی جگہ بیٹھے ہوئے احتیاط کے ساتھ وقت کا انتظار کر رہے تھے کہ اتنے میں ان کے افسر نے اپنے سامنے کچھ بندوقیں بے حفاظت پڑی ہوئی دیکھیں۔ وہ مولوی کی ہدایت کو بالکل بھول گیا اور مع ساتھیوں کے بندوقیں اٹھانے کے لئے جھپٹ پڑا۔ انگریزوں کی نظر پڑ گئی۔ وہ چوکنے ہو گئے اور مولوی کی ساری سکیم بیکار ہو گئی"

فرنگی چاہتے تھے کہ ہر قیمت پر مولانا کو گرفتار کریں۔ اسی مقصد کے لئے فرنگی گورنر جنرل نے اپنے اعلان نمبر ۸۰۰ جی محکمہ امورِ خارجہ مورخہ ۲۰ اپریل ۱۸۵۸ء کو کہا کہ ۵۰ ہزار روپیہ اُس شخص کو ادا کیا جائے گا جو باغی مولوی احمد اللہ شاہ کو، جسے عام طور پر مولوی کہا جاتا ہے، زندہ کسی برطانوی چوکی یا کیمپ کے حوالے کرے گا۔ علاوہ ازیں یہ بھی اعلان کیا گیا کہ اس باغی یا بھگوڑے کو جو فوج سے بھاگ گیا ہو۔ عام معافی دے دی جائے گی جو مولوی کو حوالے کرے گا سوائے اُن تین آدمیوں کے جن کے نام اعلان ۴۳۰ مورخہ یکم اپریل میں ظاہر کئے جا چکے ہیں۔

اب شاہ جہان پور کی سُنیئے۔ ۳۰ اپریل ۱۸۵۸ء کا دن تھا۔ فرنگی فوج کا سپہ سالار کیمبل شاہ جہان پور پہنچا۔ شہر کی مکمل تباہی کے پیش نظر جیل کی عمارت کو ملٹری پوسٹ کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ لیفٹیننٹ کرنل ہال کو اس نئی پوسٹ کا انچارج بنا کر ۲ مئی کو کیمبل فوج کی کثیر تعداد کے ساتھ بریلی روانہ ہوا۔ اُس کی روانگی کے فوراً بعد مولانا نے ہال کی ملٹری پوسٹ پر یلغار کر دی۔ ۷ مئی کو کیمبل نے حملہ کی خبر

سننے کے بعد برگیڈیر جانز کو ہال کی مدد کے لئے روانہ کیا۔ برگیڈیر جانز ہال اور اُس کے ساتھیوں کو بچانے میں کامیاب تو ہو گیا لیکن مزاحمت کی شدت کو وہ بھی برداشت نہ کر سکا۔

۱۵ مئی کو مولانا نے اُن پر دوبارہ حملہ کیا۔ ۱۸ مئی کو کیمبل بھی پہنچ گیا لیکن اُس نے بھی اپنی مدد کے لئے کرنل کوک کو بلا بھیجا۔ اُس کی آمد کے بعد مولانا شاہ جہان پور چھوڑ کر محمدی چلے گئے۔ بعض مصنفین کا کہنا ہے کہ محمدی میں مولانا نے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا اور نانا راؤ کو دیوان مقرر کر کے ایک عارضی حکومت قائم کر لی۔ جنرل بخت کو وزیر دفاع، مولانا سرفراز علی کو قاضی القضاۃ، اور مولانا لیاقت علی، مولانا فیض احمد اور ڈاکٹر وزیر خاں کو کونسل کا رکن مقرر کیا۔ کچھ سکوں پر یہ کندہ کرایا،

سکہ زد در ہفت کشور خادم محراب شاہ
حامیٔ دین محمد احمد اللہ پادشاہ

صاحب قیصر التواریخ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "نشۂ غرور وقت جو دفاع میں سما گیا تھا شہزادے سے بھی طالب بیعت و فرمانبرداری مثلِ اور خادموں کے ہوا۔ شہزادہ اس حرکت سے خفا ہو کر سندیلہ میں آگیا" [۱]

لیکن یہ تبصرہ مبنی بر تعصب معلوم ہوتا ہے۔ اگر مولانا نے ایسا کیا تھا تو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ دہلی کا تخت اب خالی پڑا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کو قیدی بنا لیا گیا تھا۔ برجیس قدر ایک والی تھے نہ کہ آزاد بادشاہ۔ یقیناً علماء نے کسی مرکزی اتھارٹی کی قانونی ضرورت پر اصرار کیا ہوگا، جس کے احکام کے تحت ہی جہاد قانونی ہو سکتا [۲]۔

۲۴ مئی کو جانز نے بھی محمدی کا رخ کیا۔ بدقسمتی سے اس دوران میں مولانا کے بہترین جانباز اور رفقاء اُن کا ساتھ چھوڑ گئے تھے کیونکہ لگاتار پسپائی سے اُن کا مورال بُری طرح متاثر ہوا تھا۔ جہاں تک مولانا کا تعلق ہے، اُن کی

---

[۱] ایضاً ص ۷۷۴

[۲] ULEMA IN POLITICS, P.194, FOOTNOTE

اولوالعزمی میں اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔
مئی ۱۸۵۸ء میں آپ نے اودھ دوبارہ زیر کر لیا تھا۔ اب لڑائی کا رنگ یہ ہو گیا کہ کولن اودھ کو فتح کرتا تو مولانا روہیل کھنڈ پر قبضہ جما لیتے تھے۔ وہ روہیل کھنڈ کو لیتا تھا تو وہ اودھ کو فتح کر لیتے تھے۔ اس پریشانی سے نجات حاصل کرنے کے لئے فرنگیوں نے اس آہنی ہاتھ کو شل کر دینے کا فیصلہ کیا۔ ان دنوں مولانا اودھ کے بڑے بڑے راجاؤں اور روساء سے مدد لینے کا ارادہ کر رہے تھے۔ ان میں ایک پاون کا راجہ جگن ناتھ بھی تھا۔ مولانا نے بیگم حضرت محل کی طرف سے اُسے مجاہدین کی امداد کے لئے پیغام بھیجا۔ راجہ نے اثبات میں جواب دیا لیکن مذاکرات کے لئے آپ کو پایاں آنے کی دعوت دی۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ فرنگیوں نے مولانا کو زندہ یا مُردہ گرفتار کرنے کے لئے بیش بہا انعامات مقرر کر رکھے تھے۔ ساتھ ہی آپ کو پناہ دینے والوں کے لئے ہولناک سزاؤں کا بھی اعلان ہو چکا تھا۔ لیکن حُر بھی کبھی ایسی بھبکیوں سے ڈرا کرتے ہیں۔ ۵ جون کو آپ راجہ سے گفت و شنید کے لئے روانہ ہوئے۔ پایاں پہنچ کر آپ نے شہر کے دروازہ کو بند پایا۔ فصیل پر جگن ناتھ اپنے بھائی بلدیو سنگھ کے ساتھ مسلح سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ آپ صورت حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے بھی فصیل کے نزدیک محض اس خیال سے چلے گئے کہ جگن ناتھ کو آمادہ مذاکرات کر سکیں۔ ابھی آپ فصیل کے قریب پہنچے ہی تھے کہ بلدیو سنگھ نے آپ پر گولی چلا دی۔ اس طرح ایک بدبخت غدار کے ہاتھوں آپ نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔
راجہ کے بھائیوں نے مولانا کا سر کاٹ لیا۔ راجہ اسے رومال میں لپیٹ کر ہاتھی پر سوار ہوا اور شاہ جہان پور کے مجسٹریٹ منی کے پاس لے گیا۔ وہ اپنے گھر کھانے کے دوران فرش پر آپ کے سر کو گیند کی طرح اِدھر اُدھر لڑھکاتا رہا۔ بعد میں آپ کا سر پولیس اسٹیشن کے صدر دروازے پر لٹکا دیا گیا۔ راجہ جگن ناتھ نے اپنی غداری کا معاوضہ پچاس ہزار روپیہ وصول کیا۔ لندن میں اس خبر سے چراغاں ہوا جیسا کہ

ہومز نے لکھا ہے "شمالی ہندوستان میں ہمارا سب سے بڑا دشمن، سب سے خطرناک انقلابی ختم ہوگیا ہے۔"

مولانا احمداللہ شاہ کی قبر شاہ جہان پور کے قریب گنج نامی ایک موضع میں ہے۔ بعد میں مولانا سید طفیل احمد نے آپ کی قبر پر کتبہ لگوایا۔

راجہ جگن ناتھ نے ۲۷ جون ۱۸۵۸ء کو بابت خیر خواہی فرنگی حکام درج ذیل خط لکھا:

"جناب والا مناقب عالی شان مع الجود والاحسان سکندر شوکت والا شان قدرداں ہوا خواہاں دام حشمتہ وشوکتہ،

بعد ادائے آداب فدوی وجاں نثار گزارش گر مدعا ہے۔ سرفراز نامہ افتخار آمود محررہ ۲۷ جون ۱۸۵۸ء نے محتوی خوشنودی مزاج حضور فیض گنجور سبب آنے حکم محکم جناب مستطاب معلیٰ القاب نواب، گورنر جنرل بہادر دام اقبالہٗ۔ بذریعہ تار برقی مقام فرخ آباد سے۔ بمزید قدردانی وکمال خوشنودی۔ عطائے مبلغ پچاس ہزار روپیہ، بجلدوئے مقتولی "مولوی" اور طلبی فدوی جاں نثار مذکور باکنور بلدیو سنگھ واسطے لینے روپیہ مسبوق الذکر۔ اور اطلاع کرنے اس خوشخبری سے راجا "دونی سنگھ متولی والہ" کو شرف صدور و عزورود فرمایا۔ کمال عزت اور آبرو ہم چشموں میں بخشی اللہ تعالےٰ سرکار فلک اقتدار کو ساتھ اس قدر قدردانی کے خوش اور سلامت رکھے۔ حق یہ کہ جو سرکار گردوں وقار نے سرفرازی اور قدردانی اس ذرہ بے مقدار کی فرمائی ہزار زبان سے شکر پرورش سرکار گردوں عشر عشیر ادائے شکر کا ہو نہیں سکتا۔ ظہور اس کار نمایاں کا صرف باقبال سرکار ہوا ورنہ بدوں یاوری اقبال سرکار، ظہور ہونا کسی امر خیر خواہی سرکار کا غیر ممکن بلکہ . . . محال ہے متصور۔ چونکہ ہنوز باغیاں بد انجام سکندر آباد اور حوالی اس کے میں موجود اور اجتماع ان کے سے احتمال وقوع واردات آتش زنی وغیرہ۔ جیساکہ دو تاریخ میں کیا رہتا ہے۔ اغلب کہ جلد منتشر اور درہم برہم ہو جاتے ہیں بعد عرصہ ہفتہ یعنی تاریخ

پنجم جولائی ۱۸۵۸ء روز دوشنبہ حاضر خدمت فیض موہبت بندگان عالی متعالی کے ہوں گے اور راجا موتی سنگھ کو اس خوش خبری سے اطلاع کر دی۔ انتہا عا گزارش کیا۔[1]

مولانا کی شہادت کے ساتھ ہی روہیل کھنڈ کی جنگِ آزادی کا باب اختتام پذیر ہوا۔ مولانا نے انقلابی کام کا آغاز اس وقت کیا جب کسی کو اس جنگ کے آثار کا بھی پتہ نہ تھا۔ جہاد کا زبر زبن جال بچھانے والوں میں اُن کا بڑا ہاتھ تھا، انھوں نے تمام اودھ اور آگرے تک خود ہر جگہ پہنچ کر خفیہ سوسائٹیاں قائم کیں اور اپنے موثر کلام اور تقاریر سے لوگوں کو فرنگی حکومت سے نجات حاصل کرنے کی تلقین کرتے۔ آپ ایک بہترین مقرر تھے۔ جب آگرہ میں تھے تو ہزاروں ہندو مسلم آپ کو سننے کے لئے جمع ہوتے تھے۔ آپ نے ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک ہاتھ میں قلم لے کر انقلاب کے لئے علاقوں کے علاقے تیار کر دیئے یہ آپ کی مقبولیت کا اعجاز تھا کہ جب آگرہ میں جہاد شروع ہوا تو اس کی قیادت کوتوال نے کی اور کچھ عرصہ تک اسے دبایا نہ جا سکا۔

آپ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بانیوں میں سے تھے۔ آپ کی فرنگیوں سے کم و بیش بیس دفعہ معرکہ آرائی ہوئی۔ اپنے بہترین ذرائع اور ساز و سامان کے باوجود فرنگیوں کو یہ حسرت ہی رہی کہ آپ کو زیر کریں۔ آپ کوئی تربیت یافتہ سپاہی نہ تھے پھر بھی ایک جرنیل کی حیثیت میں آپ نے بہترین مہارت کا مظاہرہ کیا۔ آپ شجاعت کے شیر نیستاں تھے۔ میدان کارزار میں اُسی جگہ ہوتے جہاں موت کا اژدھا اپنا منہ کھولے صاف نظر آتا تھا۔ آپ دشمن پر صاعقہ بن کر ٹوٹتے۔ آپ کے حربی طریقوں سے انگریزوں کے سر چکرا جاتے۔ میلیسن شاہجہانپور کے معرکے کے متعلق لکھتا ہے کہ مولانا کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یورپ کا کوئی جرنیل لڑ رہا ہو۔ آپ کو امکانات اور صورت حال کا جائزہ

---

[1] ماثر دلاوری ص ۲۳۲ - ۲۳۳

لینے میں کمال حاصل تھا۔ میلیسن لکھتا ہے "مولوی ایک بہت بڑا تجربہ کار شخص تھا۔ اِن کے سوا کوئی شخص فخر کے ساتھ یہ سچا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ میں نے کولن کیمبل کمانڈر انچیف ہند کو دو بار میدان میں شکست دی۔ مولوی احمداللہ شاہ محُبِّ وطن تھا۔ اس نے کسی نہتے کا خون بہا کر اپنی تلوار کو خراب نہ کیا۔ اس نے بہادری کے ساتھ ڈٹ کر کھُلے میدان میں ان بدیشیوں کے ساتھ جنگ کی، جنہوں نے اس کا وطن چھین لیا تھا۔ ہر ملک کے بہادر لوگوں کو مولوی احمداللہ شاہ کو عزت کے ساتھ یاد رکھنا چاہیئے"۔[1]

مولانا کو فوجوں کو لڑانا آتا تھا، وقت پر چالیں سوجھتی تھیں۔ اصُولاً فوجیوں کے ہاتھوں لوُٹ مار کے حملوں کے خلاف تھے لیکن انہوں نے دُوسرے مسائل کو ہوا دیئے جانے کے پیشِ نظر ایک مدبر کی طرح اپنے رویّے میں بہت زیادہ سختی اختیار نہ کی۔[2] معقول اور منقول پر گہری نظر رکھتے تھے۔ غیوّر اور حساّس طبیعت کے مالک تھے۔ ہومز غیر ہوتے ہوُئے بھی اُن کی شان میں لکھتا ہے: "اگر اس وقت ہندوستان میں کوئی لیاقت مند آدمی تھا تو وہ مولوی صاحب موصوف تھے۔ اگر تاج شاہی سر پر رکھ دیا جاتا تو وہ اس کا استحقاق رکھتے تھے"۔[3]

---

[1] J.W. KAYE AND G.B. MELLESON, HISTORY OF THE INDIAN MUTINY(LONDON), IV,P.381.

[2] ULEMA IN POLITICS, P.193

[3] تاریخ غدر ص ۵۳۰

بحوالہ ۱۸۵۷ء میاں محمد شفیع ص ۳۲۳

جنرل بخت خاں روہیلا

اودھ کے قصبے سلطان پور کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ بخت خاں نے اس کی فضا میں پرورش پائی۔ آپ کے دادا غلام قادر خاں نے بریلی کے حافظ رحمت خاں کی بربادی کے بعد لکھنؤ کی جانب رخت سفر باندھا تھا۔ جہاں انہیں دربار لکھنؤ میں معقول خدمت مل گئی۔ ان کے ایک فرزند عبداللہ خاں دلیر ہونے کے ساتھ ساتھ وجیہ اور شکیل بھی تھے، شجاع الدولہ کے خاندان کی ایک شہزادی کی توجہ کا مرکز بن گئے! اس طرح اُن کی نوابان اودھ سے قرابتداری ہوگی۔ نواب اودھ کی طرف سے اُن کو سُلطان پور میں ایک جاگیر بھی عطا ہوئی تھی۔ یہیں یہ بخت خاں کی پیدائش ہوئی۔

بخت خاں نے سپہ گری کا پیشہ اختیار کیا۔ روہیلوں کی شجاعت آپ کو ورثہ میں ملی تھی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ ایک معمولی سپاہی سے ترقی کرتے ہوئے اعلیٰ عہدے پر پہنچ گئے۔ افغانستان کی پہلی جنگ میں فرنگی فوج کے میدانی توپ خانہ کے سب سے بڑے دیسی افسر تھے۔ جنگ میں نمایاں کارنامے انجام دیئے یہاں تک کہ اعزاز کے طور پر آپ کی توپوں پر پھُولوں کا محراب نما تاج رکھا گیا۔ آپ جلال آباد میں بھی اس توپ خانے کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ افغانستان سے واپسی پر مختلف چھاؤنیوں میں تعینات رہے، صوبہ داری کا عہدہ عطا ہوُا اور چہار سُو آپ کی شہرت پھیل چکی تھی۔

مئی ۱۸۵۷ء میں جب فوج میں فرنگیوں کے خلاف بغاوت کا پہلا شعلہ بھڑکا تو بخت خاں بریلی چھاونی میں تھے۔ جب یہ خبر آپ کی پلٹن میں پہنچی تو اُس میں بے چینی پھیل گئی یہاں تک کہ بخت خاں کے سپاہیوں نے بھی آزادی کا پرچم بلند کر دیا۔ بخت خاں اگر چاہتے کہ بغاوت کرنے والوں کو کُچل دیں

اور فرنگیوں کی خوشنودی حاصل کریں تو ایسا کر سکتے تھے لیکن آپ نے جاہ وجلالت کو وطن کی پکار پر قربان کر دیا۔ لوگوں نے فرنگیوں کا قتل عام کر کے جیل خانہ توڑ دیا اور خزانے پر قبضہ کر لیا اور پھر بخت خاں کو اپنا قائد مقرر کیا، جنہوں نے حافظ رحمت خاں کے پوتے بہادر خاں کو بادشاہی کی نیابت کے عہدے پر فائز کیا۔

یکم جولائی کو بریلی برگیڈ نے بخت خاں کی سرکردگی میں دریائے جمنا عبور کیا۔ اس میں چار پیادہ رجمنٹیں، ایک رسالہ، ایک توپ خانہ اسپ، دو پوسٹ گنوں کے علاوہ پانچ لاکھ روپے بھی تھے۔ دو جولائی کو ان مجاہدین کا ورود دہلی میں ہوا۔ بخت خاں اور ان کے فوجیوں کو خان بہادر خان نے دہلی بھیجا تھا[۱]

ظہیر دہلوی نے بخت خاں کی آمد کو یوں بیان کیا ہے۔

"سر پر انگو چھا لپٹا ہوا، کمر ہج گلے میں پڑی ہوئی پیچھے حال کھلا، بریلی والا جنرل وہی تھا۔ بظاہر تو اس کا لباس گھس کھدوں کا سا تھا، میں تو سمجھا جیسے اور پوربیئے سپاہی ہیں، یہ بھی کوئی سپاہی ہوگا"[۲] مولانا طفیل احمد منگلوری نے بخت خاں کے ساتھ آنے والی سپاہ کی تعداد چودہ ہزار بیان کی ہے۔ اِس فوج کی چھ ماہ کی تنخواہ خود بخت خان نے پہلے دے دی تھی اور چار لاکھ روپیہ بادشاہ کو نذرانے میں دیا تھا[۳] بہادر شاہ ظفر نے نواب احمد قلی خاں، اپنے خسر، کو بخت خاں کے استقبال کے لئے بھیجا۔ شرفِ باریابی پر بخت خاں نے بادشاہ کو اپنی خدمات پیش کیں تو انہوں نے آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ گویا یہ اس امر کا اظہار تھا کہ آپ کی خدمات قبول کر لی گئی ہیں۔ بادشاہ نے آپ کی دعوت کے لئے اپنے خاصہ سے ستر توڑے بھجوائے اور فرزند کا خطاب دیا۔ اس کے علاوہ ایک تلوار اور ڈھال بھی عطا کی اور یہ منادی کرادی کہ تمام فوج بخت خاں سے ہدایات وصول کرے

---

[۱] اخبار الصنادید، نجم الغنی خاں۔ لکھنو، ۱۹۰۸ء۔ ص ۵۵۰-۵۵۱

[۲] داستان غدر ظہیر دہلوی [۳] مسلمانوں کا شاندار مستقبل ص ۹۰

جو اُن کے جرنیل ہیں۔

بادشاہ سے رخصت ہو کر بخت خاں اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچے اور انہیں بتایا کہ "بادشاہ نے میری خدمات قبول کر لیں ہیں، اب آپ میں سے کون کون میرا ساتھ دینا چاہتا ہے"۔ سب بیک وقت بولے: "ہم سب آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہیں اور آپ کا حکم مانیں گے"۔ اس کے بعد حلفِ وفاداری اٹھایا گیا۔

اب دہلی کی حالت زار دیکھیے۔ ہر سو افراتفری کا عالم تھا۔ نظم تھا نہ ضبط دہلی میں سپاہ نے بدنظمی پھیلا رکھی تھی اور دوکانداروں کو لوٹ لیتے تھے اور ان کا الزام شہزادوں پر رکھتے تھے[1]

بخت خاں نے دہلی میں ورود کر کے حریت پسندوں کی آرزو میں جان ڈال دی۔ اب تنظیم، استقلال اور عزیمت کا دور شروع ہوا۔ بخت خاں نے اس سلسلے میں بادشاہ کو اعتماد میں لیا اور شہر کے کوتوال کو حکم دیا کہ شہر میں آئندہ لوٹ مار ہوئی تو اُسے پھانسی دے دی جائے گی۔ دوکانداروں کو اپنے پاس ہتھیار رکھنے کا حکم دیا اور یہ بھی صراحت کر دی کہ جس کسی کے پاس ہتھیار نہ ہوں تو حکومت اُسے ہتھیار مفت دے گی[2] اس کے علاوہ بادشاہ کو کہہ دیا کہ اگر کوئی شہزادہ شہر کو لوٹے گا تو اس کی ناک کٹوا دی جائے گی۔ بادشاہ نے کہا کہ اُسے یہ اختیار حاصل ہے[3] بخت خاں یہ بھی چاہتے تھے کہ انگریزوں کے خلاف جنگ کے لئے انہیں قانونی پشت پناہی حاصل ہو۔ اگرچہ بہادر شاہ مرکزی سیاسی اتھارٹی اور مسلمانوں کے اقتدار اعلٰے کا محور تھے اور مکرم جانے جاتے تھے لیکن مسلم عامۃ الناس کی حمایت حاصل کرنے کے لئے جنگ کی توثیق ایک مذہبی فرض کے طور پر ضروری

---

[1] تاریخ عہد انگلشیہ، ذکاءاللہ، ص ۶۹۵

[2] ایضاً ص ۶۹۶

[3] ایضاً ص ۶۹۶

تھی۔ جامع مسجد میں ممتاز علماء کا اجلاس بلایا گیا اور مسلمانوں کو بتایا گیا کہ ان حالات میں مسلمانوں پر فرنگیوں کے خلاف ہتھیار اُٹھانا فرض ہوگیا ہے[1] عوام النّاس کا دل جیتنے کے لئے نمک اور شکر پر محصُول معاف کیا، ہندوؤں کا دل جیتنے کے لئے عیدالاضحیٰ کے موقعہ پر شاہی فرمان جاری کرایا کہ مسلمان گائے ذبح نہ کریں۔

اس دوران میں یہ خبریں موصول ہونے لگیں کہ فرنگی دہلی پر حملہ آور ہونے والے ہیں۔ بخت خاں نے پیش بندی کے طور پر ۴ جولائی کو علی پور پر حملہ کردیا اور فرنگیوں کو پسپائی پر مجبور کردیا۔ سپاہیوں کے حوصلے بڑھانے کے لئے آپ نے سپاہیوں کو بادشاہ کا یہ پیغام بھی پہنچایا کہ جو شخص بھی میدانِ جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دے گا اسے پانچ بیگھہ زمین انعام میں دی جائے گی اور اعزازی عہدے سے بھی نوازا جائے گا۔ پانچ روز بعد آپ نے ہندو راؤ کے مکان کے عقب میں واقع ٹیلے پر نو ہزار کی جمعیت کے ساتھ فرنگیوں پر حملہ کیا اور تیس ہزار کی میدان ان سے چھین لیا۔ اس طرح بہت سا مالِ غنیمت ہاتھ لگا۔ اگلا معرکہ چودہ جولائی کو ہوا۔

اِدھر بخت خاں نے دہلی کو سہارا دیا، اُدھر اُمراء، درباریوں اور شہزادوں نے اُن کے اردگرد سازشوں کا جال بُننا شروع کردیا۔ مختلف حیلوں بہانوں سے جنرل کے ہر اقدام کو ہدفِ تنقید بنانا اُن کا شیوہ ہوگیا۔ ۱۷ جولائی کو شہزادہ میرزا مُغل نے تحریری شکایت کی جو محض معاندانہ نوعیت کی غماز تھی۔ ۲۹ جولائی کو سُپر مائی تر کے صُوبہ دار قادر بخش نے جنرل بخت خاں پر فرنگیوں پر حملے میں غفلت کا الزام لگایا۔ اس سے ایک ہفتہ قبل خود آپ بہادر شاہ ظفر سے عرض کرچکے تھے کہ "بعض شر پسند مجھ پر انگریزوں کے ساتھ ملی بھگت کا الزام دھرتے ہیں" بادشاہ

---

[1] صادق الاخبار، دہلی، ۲۷ جولائی ۱۸۵۷ء

بحوالہ۔ ص ۱۹۹ ULEMA IN POLITICS,

نے کہا " تمہاری خیر خواہی میں مجھے کچھ شبہ نہیں ! مجھے افسوس ہے کہ بد نہاد آدمی اس غلط بات کو مشہور کر کے تمہاری دل آزاری کرتے ہیں "

حکیم احسن اللہ خاں نے بھی بیان کیا ہے کہ تمام سپاہی جنرل کے ماتحت جنگ کے لیے آمادہ نہ تھے اور اس کے گورنر جنرل بنائے جانے پر ناراض تھے۔ کہتے تھے کہ مرزا مغل کو تمام اختیارات دیئے جا چکے ہیں اور وہ ہر فرض انجام دینے کا اہل ہے۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ شکایات کا یہ دفتر شہزادوں کے ہی ایماء پر کھولا گیا۔ استدلال یہ پیش کیا گیا کہ بخت خاں بنیادی طور پر توپ خانہ کا افسر ہے اُسے لڑانے کا کوئی تجربہ نہیں۔ ۳ اگست کو خود بخت خاں نے بادشاہ سے شکایت کی کہ اب سپاہی اُن کا حکم نہیں مانتے تو بادشاہ نے کہا کہ جو سپاہی حکم نہیں مانتے اِن سے شہر خالی کرنے کے لئے کہہ دیا جائے۔ ۲۹ اگست کو بخت خاں نے اسی نوع کی دوبارہ شکایت شاہ سے کی تو انہوں نے جواب دیا کہ " میں تم سے راضی ہوں۔ تم ہی سپاہ کے سپہ سالار ہو " اب بادشاہ نے شکایت کنندگان کو بھی سمجھایا کہ باہر دشمن گھات لگائے بیٹھا ہے اور تم لوگ نفاق کا بیج بو رہے ہو۔ مگر اُن پر کوئی اثر نہ ہوا۔ چنانچہ تنگ آکر بادشاہ نے فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصے کا سپہ سالار مرزا مغل، دوسرے حصے کا جنرل بخت خاں اور تیسرے حصے کا میرزا ابوبکر کو مقرر کیا۔ فوج اب تین حصوں میں بٹ گئی تھی۔ بخت خاں کو اس تقسیم سے دلی صدمہ پہنچا لیکن قومی یک جہتی کی خاطر آپ برابر دفاعی تدابیر اختیار کئے رہے۔

مجاہدین کی قوت بڑھانے کے لئے بخت خاں نے با اثر لوگوں کو ہمنوا بنانے کی بھی کوشش کی اور اس مقصد میں کامیابی بھی حاصل کی۔ آپ کا ایک خط جنرل

---

[1] مقدمہ بہادر شاہ ظفر، مرتبہ گیرٹ، ص ۲۸۱

سدھاری سنگھ کے نام درج ذیل ہے،

"محمد بخت خاں گورنر بہادر خاں اور دہلی کے دارالخلافہ میں جو فوج ہے اس کے سپاہی افسران آداب بجا لاتے ہیں اور تم کو مبارکباد دیتے ہیں۔ جو بہادرانہ کارنامے تمہارے متعلق ہیں ہم سب کو ان پر فخر ہے، ہم میں سے ہر شخص اور تمہارے بادشاہ شب و روز عیسائیوں کو تباہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خدا نے چاہا تو بہت تھوڑے عرصہ میں دہلی کا ملک ان سے پاک ہو جائے گا۔"

سدھاری سنگھ نے جواب دیا۔

"خدا کے فضل سے دہلی کی جو سلطنت وجود میں آئی ہے، عالم طفولیت میں ہے۔ خدا نے آپ کو اس بچہ کی پرورش کے لئے بھیجا ہے۔ آپ کے تحت پانچ دستے ہیں اور آپ کا خطاب جنرل بہادر ہے اور آپ کے ہاتھ ہر قسم کی قوت ہے۔"[1]

۱۴ ستمبر کو فرنگیوں نے دہلی پر فیصلہ کن حملہ کیا۔ دو روز تک محصورین نے مزاحمت جاری رکھی لیکن اس کے بعد جنوبی سمت کے تین دروازوں یعنی اجمیری دروازہ، ترکمان دروازہ اور دہلی دروازہ سے نکلنا شروع کر دیا۔ ۱۶ ستمبر بہادر شاہ ظفر خود ہوادار میں بیٹھ کر فوج کے ساتھ مقابلے کے لئے نکلے اور قلعہ سے کوئی دو سو گز دور لال ڈگی کے پاس ٹھہرے۔ خوشامدیوں نے عرض کیا کہ یہاں انگریزی فوج کی گولیاں آرہی ہیں، اس لئے حضور کا یہاں ٹھہرنا کسی طور بھی مناسب نہیں[2] ۱۹ ستمبر کو شہر کا بڑا حصہ انگریزوں کے قبضہ میں آگیا تو شاہ نے قلعہ سے نکل جانے کا ارادہ کیا تو بخت خاں نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا؛

"حضور کے اجداد نے اس سے بڑھ کر شکستوں اور ناکامیوں کا مقابلہ کیا ہے۔

[1] غدر کا ریکارڈ، گوری شنکر
بحوالہ بہادر شاہ ظفر اور اُن کا عہد، رئیس احمد جعفری، ص ۸۴۳ - ۸۴۴

[2] دی ٹرائل آف بہادر شاہ، ص ۱۶۷، بادشاہ کے میر منشی مکھن لال کا بیان، طبع ۱۹۳۲۔

شہنشاہ بابر بعض اوقات دشمنوں میں ایسے گھرے ہیں کہ تنہا بھاگنے کے سوا چارہ کار نہیں رہا تھا۔ شہنشاہ ہمایوں کیسی بے کسی اور بے بسی میں بھاگ کر ایران گئے تھے مگر ان کے استقلال نے تمام دشواریوں اور مشکلات کو ختم کر لیا جس کے بعد ان کے خاندان (مغلیہ) نے اس سرزمین پر سینکڑوں برس حکومت کی۔ آپ اس بزم عالم افروز کی شمع حقیقی ہیں اور آپ کے ساتھ تو ملک کے بچے بچے کی ہمدردی ہے۔ تمام ہندوستان آپ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر مرنے مارنے کو تیار ہے۔ اگر انگریزوں نے دہلی کو فتح کر لیا ہے تو مضائقہ نہیں۔ ہمارے لئے ہندوستان کھلا پڑا ہے۔ میرے ساتھ تشریف لے چلئے۔ شہر لڑائیوں کے لئے مناسب مقام نہیں ہوتے اور شہر دہلی کا موقع اور محل تو خاصا خراب تھا، شہر نشیب میں تھا، انگریزی فوج پہاڑی پر تھی۔ چند ماہ جو ہم نے انگریزوں کا مقابلہ کیا اور شہر کو بچائے رکھا، یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ نیز آپ نے مرزا مغل کو سپہ سالار بنا دیا تھا جنہیں فنون جنگ کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ باہر سے رسد لانا بھی سہل نہ تھا۔ اگر ہم باہر نکل جائیں گے تو بہت کچھ کر سکیں گے۔

انگریز ہمیں عیسائی بنانا چاہتے ہیں۔ ایسی حالت میں آپ یقین کیجئے کہ اگر آپ محفوظ مقامات پر بیٹھ کر انگریزوں کا مقابلہ کریں گے تو تمام ملک ہمارا ساتھ دے گا۔

آج انگریزوں کے مددگار ہمارے ہی ملکی بھائی ہیں جن کو بہلا پھسلا کر اور لوٹ اور انعام کے وعدے دے کر وہ سمیٹ لائے ہیں۔ کل جس وقت ہمارے پاؤں مضبوط ہو جائیں گے تو ہم بھی ان سے اس قسم کے وعدے کر سکیں گے جو انگریزوں نے ان سے کئے ہیں اور ہمارے ساتھ مل جانا ان کا یقینی ہو گا۔

اگر حضور میرے ساتھ تشریف لے چلیں تو چند روز میں ہر چیز کو درست کر لوں گا اور ظل سبحانی کو ہر فکر اور تکلیف سے محفوظ رکھوں گا۔"

بہادر شاہ ظفر بخت خاں کی تقریر سے بہت متاثر ہوئے اور کہا اس وقت تو ہم ہمایوں کے مقبرے میں جاتے ہیں۔ تم صبح وہاں اگر ہم سے ملو تو تمام اُمور کا فیصلہ ہو جائے گا۔[۱]

اگلے روز تک سارا وقت ملکہ زینت محل اور مرزا الٰہی بخش دونوں نے بادشاہ کو بخت خاں کی باتوں پر توجہ نہ دینے پر آمادہ کرنے میں گزارا۔ ملکہ کی کوشش یہ تھی کہ انگریزوں سے بات چیت کر کے معاملہ فہم ہو جائے کیونکہ اُسے اپنے بیٹے جواں بخت کی حفاظت کا بہترین ذریعہ یہی نظر آتا تھا۔ اُس کی اور مرزا الٰہی بخش کی آپس میں بھی سازباز تھی جو باسورتھ سمتھ کے بقول میجر ہوڈسن کا تنخواہ دار تھا۔[۲] اُس کی ایک دختر بہادر شاہ ظفر کے دوسرے ولی عہد فخرالدین فتح الملک عرف مرزا فخرو کے عقد میں تھی۔ اُس نے یہ دلیل پیش کی کہ "آپ پردہ نشین بیگمات، شہزادیوں اور شہزادوں کو کہاں کہاں لئے پھریں گے۔ اگر آپ نہ جائیں تو میں انگریزوں سے مل کر تمام معاملات کی صفائی کروا دوں گا۔ اور آپ پر یا آپ کی اولاد پر ایک حرف نہ آنے دوں گا۔[۳]

دراصل بہادر شاہ ظفر میں عزم و ہمت نام کو بھی موجود نہ تھی۔ میرزا الٰہی بخش اُن کو رات کے وقت اپنے مکان پر لے گیا اور انہیں بخت خاں کی معیت میں نہ لے جانے پر آمادہ کر لیا۔[۴] آخری بار بخت خاں نے بہادر شاہ کو تیموری خون کا واسطہ دے کر پھر اپنے ساتھ چلنے پر اصرار کیا تو دوسری طرف مرزا روکتا تھا۔ یہاں تک کہ بخت خاں ایک موقع پر مرزا کو ختم کرنے پر تیار ہو گئے۔ بادشاہ نے

۱؎ دہلی کی جان کنی ص ۳۷ - ۳۹

۲؎ بحوالہ ۱۸۵۷ء، غلام رسول مہر، ص ۱۷۳

۳؎ دہلی کی جان کنی، ص ۴۱، عروج عہد سلطنت انگلشیہ، ص ۶۴۷، میلی سن کی ہسٹری آف انڈین میوٹنی جلد چہارم، ص ۵۰ - ۵۱

۴؎ میلی سن جلد چہارم ص ۵۴

بخت خاں کی رائے پسند کی لیکن خود اپنی ضعیفی کو آڑ بنایا اور کہا کہ میں اپنا معاملہ تقدیر کے حوالے کرتا ہوں۔ آپ جہاد جاری رکھیں تاکہ ہندوستان کی آبرو رہ جائے[1] یہ بحث دو گھنٹے جاری رہی۔ آخر ناکام ہوکر بخت خاں دل شکستہ ہوکر مقبرہ ہمایوں سے باہر چلے آئے۔ انہیں شہسوار بابر کی اولاد پر رونا آرہا تھا۔ ع

حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے!

دریا عبور کرکے بخت خاں بدایوں اور فرخ آباد سے ہوتے ہوئے لکھنؤ جا پہنچے جہاں آزادی کے متوالے ابھی تک فرنگیوں سے برسرِپیکار تھے۔ ناکامی چونکہ مقدر بن چکی تھی، ہر محاذ پر ناکام رہے۔ مایوس ہوکر نیپال کا رُخ کیا اور وہیں ۱۳ مئی ۱۸۵۹ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔

جب تک بخت خاں دہلی میں وارد نہیں ہوئے تھے اس وقت تک جہاد کا چرچا بہت کم تھا۔ لیکن آپ کے کمان ہاتھ میں لیتے ہی جنگ کا پانسہ بدل گیا۔ فرنگیوں نے بار بار اپنی قیادت میں تبدیلی کی۔ کبھی این سن آیا تو کبھی سر ہنری برنارڈ، کبھی ریڈ جنرل بنا ہوا ہے تو کبھی برگیڈئر آرچ ڈیل ولسن کی تقرری عمل میں آرہی ہے۔ فرنگی آپ کے نام سے دہلتے تھے اور یارانِ بزم آپ کو گالیاں دیتے۔ انگریز نواز مصنف مولوی ذکا اللہ آپ کو "کم بخت خاں" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر بہادر شاہ آپ کے مشورے پر عمل کرتے تو برِصغیر کی تاریخ کسی اور انداز میں لکھی جاتی۔ اگرچہ آپ کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی پھر بھی آپ کی ناکامی صد ہزار فتح وظفر سے زیادہ قابل فخر اور مایۂ نازِ رشک تھی۔

---

[1] دہلی کی جاں کنی ص ۴۲۔

شہزادہ فیروز شاہ !

یہ خاندان مغلیہ کے آخری فرمانروا بہادر شاہ ظفر کے چچیرے بھائی اور فرخ سیر کے نواسے تھے ۔ پیکر شجاعت تھے ، انگریزوں سے نفرت کرتے تھے حج بیت اللہ کی غرض سے ابھی اندور تک ہی پہنچے تھے کہ جنگِ آزادی کا آغاز ہو گیا ۔ ارادہ حج فسخ کیا اور سیدھے میدان کارزار میں جا پہنچے ۔ کچھ عرصہ کے لیے ریاست اندور کا مقام مندسور فیروز شاہ کا ہیڈ کوارٹر بن گیا ۔ جہاں آپ تین ہزار باغی سپاہیوں اور کثیر تعداد میں نمازیوں کی جمیعت جمع کرنے میں کامیاب ہو گئے گردو نواح کے علاقوں میں بھی کافی حد تک سرگرمی پائی جاتی تھی ، اس کا انکشاف اُن خطوط سے ہوا جو پکڑے گئے [1] قلعہ دھار سے مجاہدین نے شہزادہ فیروز شاہ کو فوری امداد کی اپیل کے سلسلے میں جو خط بھیجا وہ نواب جاورہ کے گماشتوں کے ہتھے چڑھ گیا ۔ یہ فرنگیوں کا حلیف تھا ۔ چنانچہ یہ خط فرنگی ریذیڈنٹ کرنل وُڈ رانٹ کو پیش کر دیا گیا ۔ خط ملاحظہ ہو ۔

"ہمارے اور برطانویوں کے درمیان لڑائی ہوئی جس میں ہم ہار گئے ۔ ہم نے قلعہ دھار میں پناہ لی ہے ۔ آپ ہمیں دو ہزار سے لے کر تین ہزار فوج سے مدد کیجئے ۔ تاکہ ہم فتح حاصل کر لیں ۔ خُدا را خط دیکھتے ہی امداد بھیجئے تاکہ ہم شہنشاہ کی عظمت کا تحفظ کر سکیں اور ہم کیا لکھیں ۔ ہماری شکست آپ کی شکست ہے ۔" [2]

---

[1] THE GREAT REVOLUTION OF 1857, SYED MOINUL HAQ, P. 358-360.

[2] روزنامہ انجام، کراچی، یکم دسمبر ۱۹۵۵ء

فرنگی چوکنّا ہو گئے اور مندسور پر حملہ کر دیا۔ شہزادے کو شکست سے دوچار ہونا پڑا[1] متعدد مقامات پر ہوتے ہوئے لکھنؤ جا نکلے جہاں بیگم حضرت محل کے سوا باقی لوگوں نے آپ کی آمد پر بے دلی کا اظہار کیا۔ کیونکہ اُن تمام لوگوں کا خیال تھا کہ کہیں آپ شاہی خاندان کی نسبت سے جاہ و اقتدار پر قابض نہ ہو جائیں۔ بیگم حضرت محل نے خلعت سے نوازا اور پانچ ہزار روپیہ نقد دے کر چھتر منزل میں قیام کا بندوبست کیا۔

لکھنؤ میں بیگم حضرت محل کی حکومت تھی اور مولانا احمد اللہ شاہ کا طوطی بول رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد دونوں کو شہزادہ فیروز شاہ سے اختلافات پیدا ہو گئے۔ جب شہزادے نے وہاں اپنے قیام کو مشکل محسوس کیا تو وہاں سے کوُچ کر لیا۔ گنگا اور جمنا عبور کرنے کے بعد ریاست گوالیار میں جا پہنچے۔ وہاں فرنگیوں سے کئی معرکے ہوئے۔ آخر تانیتا ٹوپی سے جا ملے لیکن نانا راؤ کی طرح شہزادے کو بھی تانیتا سے الگ ہونا پڑا۔

شہزادہ فیروز شاہ نے ریاست دھار، مہدپور، گوریا اور دیگر ریاستوں کو کمر بستہ ہونے پر آمادہ کیا لیکن نظام افضل الدولہ کی، جسے اقتدار سنبھالے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، رگِ حمیت نہ پھڑکی۔ اس کا ایک سبب اس کے وزیر سالار جنگ مختار الملک کا ایرانی نژاد ہونا بھی تھا جس نے عوام کے جوش اور جذبات کی پرواہ نہ کی اور علمِ جہاد بلند نہ کیا۔

۲۲ اپریل ۱۸۵۸ء کو فرنگیوں نے مرادآباد کی طرف پیش قدمی کی اسی روز آپ بھی وہاں جا پہنچے اور نواب رام پور کے تمام فرستادوں کو نکال باہر کیا۔ فرنگی بریگیڈیر جونز کی قیادت میں تازہ کمک لے کر آ گئے۔ شہزادے کو اپنی کم طاقت کا بخوبی علم تھا اس لیے بریلی کا رخ کیا۔ فرنگی ۳ مئی تک بریلی کی طرف پیشقدمی تک،

---

[1] قیصر التواریخ، جلد دوم، ص ۵۷۴

چودہ سو تھے جن میں چار سو سوار اور ایک ہزار پیادہ تھے۔ اُن کے ساتھ آپ باڑی گئے اور وہاں سے فرنگیوں کو ناکوں چنے چبواتے دریائے گنگ کے پار چلے گئے۔

۲۵ دسمبر ۱۸۵۸ء کو تانیتا کا میجر روک سے دو گھنٹے تک مقابلہ ہُوا۔ ۱۴ جنوری ۱۸۵۹ء کو شہزادہ فیروز شاہ بھی تانیتا ٹوپی سے اندرگڑھ میں جا ملے۔ فرنگیوں کی پیشقدمی کے باعث تانیتا ٹوپی جے پور اور بھرت پور کے درمیان واقع قصبہ دیوا سا چلا گیا۔ ۱۶ جنوری کو تانیتا، نانا راؤ اور شہزادہ فیروز شاہ کے باہمی جنگی مشوروں کے وقت شوورش بھی آن پہنچا۔ اس وقت ان تینوں کا جانا کرامت تھا۔ فرنگی لشکر نے اچانک اُن پر حملہ کر کے تین سو افراد کو مقتول و مجروع کر دیا۔ اسی روز شہزادہ فیروز شاہ مع اپنے سواروں کے تانیتا ٹوپی سے جُدا ہو گئے۔

مولانا احمداللہ شاہ کی شہادت کے بعد جب مجاہدین روہیل کھنڈ میں جمع ہوئے تو شہزادہ فیروز شاہ جواب تک دھار میں نبرد آزما تھے، بھی اودھ پہنچ گئے۔ بیگم حضرت محل کے لکھنؤ سے آخری الوداعی وقت شہزادہ فیروز شاہ کو بھی لکھنؤ کو داغِ مفارقت دینا پڑا جہاں سے آپ نے وسطی ہند کا رُخ کیا۔ نواب باندہ کے پھانسی پانے کے بعد فیروز شاہ کچھ دِن اِدھر اُدھر سرگرداں رہے اور بالآخر اپریل ۱۸۶۸ء میں آپ آزاد سرحد میں پہنچ گئے اور ہیکٹا میں سیّد احمد شہید کی جماعت مجاہدین کے امیر مولانا عبداللہ سے ملاقات کی۔ چند ماہ قبل آپ سَیّدو پہنچے تھے جو اخوند کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اگرچہ آپ کی حالت ناگفتہ بہ تھی پھر بھی اخوند التفات سے ملے۔ جب مجاہدین سیّد احمد شہید بُونر پہنچے تو اخوند شہزادے کے مخالف ہو گئے شاید اس خیال سے کہ آپ کی اور مجاہدین کی اُن کے خلاف کوئی سازش تھی۔

اب شہزادے نے کابل سے ہوتے ہوئے ایران کا رُخ کیا۔ بعض کا خیال ہے کہ وہاں سے تُرکستان چلے گئے اور کچھ نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ۱۸۶۹ء تک کربلائے معلّی میں تھے۔ مستند یہی ہے کہ مکہ معظمہ چلے گئے جہاں زندگی کے بقیہ دن فقیرانہ

کے پھول کا حال بغیر بہار کے خراب ہوتا ہے اور ایک بچہ بغیر دودھ کے کہاں پنپ سکتا ہے۔"

خان بہادر خان جوانی میں بریلی میں مجسٹریٹ تھے۔ تحریک آزادی کے آغاز کے وقت پنشن پا رہے تھے۔ انگریزوں اور مقامی لوگوں دونوں میں عزت حاصل تھی، انہوں نے ایک باقاعدہ تقریب میں نظم و نسق سنبھالا[1] ۳۱ مئی کی صبح سے ہنگامے کے تمام آثار یکے بعد دیگرے رُونما ہونے لگے۔ گیارہ بجے ۶۸ ویں رجمنٹ کے سپاہی توپوں پر جا پہنچے اور آس پاس کی عمارات پر گرداب مارنے لگے۔ باقی سپاہیوں نے بندوقیں سنبھالیں، چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنائیں اور فرنگیوں کے بنگلوں کا رُخ کیا[2] اور رسالدار محمد شفیع نے بریگیڈیر سبالڈ، کپتان کربی، کرنل ٹروپ اور کپتان رابرٹ کو واصلِ جہنم کیا۔ بخت خاں نے فرنگی قیدیوں پر مقدمہ چلانے کے لئے ایک جیوری کی تشکیل کی، جس نے اُن پر فردِ جرم ثابت کیا، انہیں موت کی سزا دی گئی۔ لیکن کمشنر روپوش ہوگیا۔ اس کی تلاش کے لئے ایک ہزار روپیہ انعام مقرر کیا گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر بریلی کی آزادی کا پیغام بہادر شاہ ظفر کو بھیجا گیا۔ کہ چھ گھنٹے کے اندر تمام مقامات بدایوں، شاہ جہان پور اور مُراد آباد وغیرہ سے فرنگیوں کو نکال دیا گیا ہے۔ سفارت کے فرائض صوبیدار (اب بریگیڈیر) بخت خاں نے ادا کئے۔ یہ درخواست کی گئی کہ خان بہادر خان کے روہیل کھنڈ کے نظام ہونے کی توثیق کر دی جائے۔ چنانچہ بہادر شاہ ظفر نے بہادر خاں کو انتظام الدولہ محافظ الملک خان بہادر خاں تنویر جنگ کے خطاب سے نوازا اور روہیل کھنڈ میں وائسرائے ہونے کی سند عطا کی[3]

---

[1] اخبار الصنادید، جلد دوم، ص ۴۴۵، لکھنؤ نجم الغنی خان۔

[2] ۱۸۵۷ء، غلام رسول مہر، ص ۲۹۳

[3] THE GREAT REVOLUTION OF 1857, P.505, MOINUL HAQ.

خان بہادر خان نے بہادر شاہ ظفر کو جو عرضداشت بھیجی تھی، اس کی نقل روہیل کھنڈ کے تمام اضلاع میں بھی شائع کی گئی تاکہ مسلمان اور ہندو اپنے اختلافات ختم کر کے مشترکہ دشمن کے خلاف ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں۔

"ہندوستان کے رہنے والو! بڑے انتظار کے بعد ہماری آزادی واپس آگئی ہے۔ اب بتاؤ، تم اسے قبول کرتے ہو یا رد کرنا چاہتے ہو۔ تم اس مبارک موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو یا اپنے ہاتھوں سے دے دینے پر تیار ہو اور فائدے کے خواہش مند نہیں۔؟

"ہندو مسلمان بھائیو! تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر تم نے انگریزوں کو رہنے دیا تو وہ تم سب کو ذبح کر کے تمہارے دین و مذہب کو تباہ کر دیں گے۔ ہندوستان والوں کو اتنے عرصے سے انگریزوں نے فریب دے رکھا ہے اور انہیں کی تلوار سے ان کا گلا کاٹ رہے ہیں۔ اب ہم کو یہ غداری چھوڑ کر ملک کو بچانا چاہیئے۔ انگریز پھر تفرقہ ڈالنے کا پرانا حربہ استعمال کریں گے۔ وہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکائیں گے اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف اکسائیں گے۔ ہندو بھائیوں کو چاہیئے کہ اب وہ ان کے ہاتھ میں نہ پڑیں۔ لیکن امید ہے کہ ہندو بھائی ان کے جال میں نہ پھنسیں گے۔ ہوشیار چالاک ہندو بھائیوں سے یہ کہنا بہت ضروری ہے کہ انگریز اپنے وعدے کو ہرگز پورا نہیں کرتے۔ وہ مکاری اور غداری کے بہت عادی ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے مذہب کے سوا تمام مذاہب کو دنیا سے مٹا دینا چاہتے ہیں۔ کیا انہوں نے متبنیٰ گری کے تمام حقوق کو تباہ نہیں کر دیا؟ کیا وہ ہمارے بادشاہ کے تمام صوبے اور ریاستیں نہیں نگل گئے؟ ناگپور کی حکومت آخر کون کھا گیا؟ لکھنؤ کی حکومت کس نے لی؟ آخر وہ کون ہے جس نے ہندو مسلمانوں کی جڑیں نکال دیں؟

"مسلمانو! اگر تم قرآن کو مانتے ہو! اور ہندوؤ! اگر تم گئو ماتا کی رکشا کرتے ہو! تو تم اب اپنے چھوٹے چھوٹے اختلافات کو بھول جاؤ اور متحد ہو کر اس مقدّس جنگ میں کود پڑو! میدانِ جنگ میں ایک جھنڈے کے نیچے لڑو اور خون کے چشمے بہا کر ہندوستان کو انگریزوں کے نام و نشان سے پاک کر دو!

"اگر اس مقدّس جنگ میں مُلک کو بچانے کے لئے ہندو بھائی خلوص کے ساتھ مسلمانوں کے شریک ہو جائیں تو انعام کے طور پر وطن پرستی کے صلے میں مسلمان گائے کا ٹنا بند کر دیں گے۔ اس مقدّس جنگ میں جو خود لڑے گا، یا دوسروں کو مدد دے گا اس کو دینی اور دنیاوی آزادی اور نجات ملے گی۔ لیکن جو دشمن اس وطنی لڑائی کی مخالفت کرے گا وُہ اپنے ہی سر پر تلوار مارے گا اور خودکشی کا مرتکب ہو گا"

خان بہادر خان نے انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے راجپوتوں کا تعاون حاصل کیا اور شو بھارام بنیا کو حکومت کا دیوان مقرر کیا اور اپنی مُہر پر "الحکم للہ و مُلک اللہ" کے الفاظ کندہ کرائے۔ بدایوں میں عبدالرحمٰن خاں کو ناظم اور نیاز محمد خاں کو اُس کا نائب مقرر کیا۔ عظمت اللہ کو بخشی کے عہدے پر فائز کیا اور ضلع کے مختلف حصّوں میں اپنے تحصیلدار مقرر کئے۔ کچھ ہندو سرکشوں کو کچل کر چار یا پانچ ماہ میں ضلع میں خان بہادر خاں کی مکمل طور پر حکومت قائم ہو گئی۔ شاہ جہان پور میں غلام قادر خان کو ناظم اور عبدالرؤف خان کو فوج کی کمان دی گئی۔ موخر الذکر نے دو ماہ بعد استعفیٰ دے دیا کیونکہ راجپوت سر اُٹھا رہے تھے جن کا قلع قمع مردان علی خاں نے کیا۔ اس طرح جلد ہی بدایوں، پیلی بھیت، اونلا، شاہجہان پور، تلہار، میران پور، اور جلال آباد کے اضلاع پر خان بہادر کا اقتدار قائم ہو گیا[1]

---

[1] ایضاً ص ۵۰۷ - ۵۱۴

البتہ یوسف علی خاں والی رام پور فرنگیوں کا وفادار رہا۔ اسی طرح خان بہادر خاں نینی تال پر قبضہ نہ کر سکے جہاں فرنگیوں نے پناہ لی ہوئی تھی۔ اپنے زیر تسلط علاقے میں امن وامان قائم کرنے کے بعد خان بہادر خاں نے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں اور اودھ کے کئی ممتاز حریت پسندوں کو اپنے اردگرد جمع کیا جن سے آپ ہر معاملہ میں صلاح مشورے کرتے ظہیر دہلوی نے بریلی کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

"بریلی میں ہر طرف کے مفرورین کا اجتماع ہے اور سب سردار مثل نانا راؤ، فیروز شاہ وغیرہ جمع ہیں۔ رام پور کے تیس ہزار آدمی بریلی میں ملازم ہیں۔ اور مردانِ رام پور کا یہ حال ہے کہ ایک ایک تھان دوپٹہ کا سر سے بندھا ہوا ہے اور اس پر گوٹہ لگا ہوا ہے۔ آدھا دوپٹہ سر سے بندھا اور آدھا گھوڑے کی رکاب سے نیچے لٹکتا ہے اور چار چار لنچھ کمر سے بندھے ہیں۔ دوہری تلواروں میں ڈاب رکھی ہوئی ہے۔ گھوڑوں پر سوار ہیں اور شہر میں گھوڑے دوڑاتے پھر رہے ہیں۔ پچاس ہزار کا اجتماع بریلی میں موجود ہے۔"[1]

خان بہادر خاں کی فوج ۹۱ ویں رسالہ (۶۱۸،۴ نفوس) ۵۷۰ ویں پیادہ رجمنٹ (۴۲،۳۳۰ نفوس) اور ۴۰ توپوں پر مشتمل تھی جن میں سے بیشتر آپ کی اپنی فیکٹری میں تیار کی گئی تھیں[2]۔ اس وقت مختلف قائدین بریلی میں جمع تھے جن میں شہزادہ فیروز شاہ، مولانا احمد اللہ شاہ، بیگم حضرت محل، نانا راؤ اور راجا تیجا سنگھ قابل ذکر ہیں ان سب کی رائے یہ تھی کہ گوریلا جنگ لڑی جائے کیونکہ اسی میں بقا ہے لیکن روہیلے اسی جگہ مرنے مارنے پر تلے ہوتے تھے۔ ۲۹ اپریل ۱۸۵۸ء کی شب مجاہدین نے جنرل پینی کو ہلاک کیا لیکن طلوع آفتاب کے وقت ۴۲ ویں پیادہ فوج کے آنے سے مجاہدین نے دشمن کا دباؤ محسوس کرتے ہوئے بریلی واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ فرنگیوں نے

---

[1] داستان غدر بحوالہ واجد علیشاہ اور ان کا عہد ص ۴۰۳

[2] DISTRICT GAZETTEER, BAREILLY, P.175

بساؤلی پر قبضہ کرنے کے بعد بدایوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ خان بہادر خاں نے نینی تال پر حملے کے لئے فوج بھیجی تاکہ اُس طرف سے کسی بھی متوقع حملے کو روکا جا سکے لیکن مجاہدین لال ڈھنگی سے آگے نہ بڑھ سکے کیونکہ رام پور سے فرنگیوں کو برابر مدد مل رہی تھی۔ بجنور، مرادآباد اور بدایوں ایک ایک کرکے مسخر ہوتے چلے گئے تو بریلی اودھ کا مرکز جہاد بن گیا۔ اب کولن کیمبل نے اس کی طرف مارچ کیا۔ خان بہادر خان نے شہر سے ۵ میل باہر نکٹیا ندی کے پار ایک ندی کے کنارے ایک میدان میں اپنے مورچے لگائے پہلی صف توپوں کی تھی، دو صفیں فوجوں کی تھیں۔ ۵ مئی کو بریلی کی فیصلہ کن لڑائی صبح صادق سے شروع ہوئی۔ خان بہادر خاں کی فوج میں ایک دستہ روہیلہ غازیوں کا بھی تھا۔ گورا پلٹن ۹۳ کے سرجنٹ میجر نے ۱۸۵۷ء کے معرکوں کی یادداشت میں ان کے متعلق لکھا ہے کہ

"ان کی داڑھیاں سفید تھیں، انگلی میں چاندی کی انگوٹھی پہنے ہوئے تھے جس کے نگینہ پر اللہ کندہ تھا۔ ہر غازی کی کمر میں سبز رنگ کا پٹکا تھا۔ وُہ روئی کی صدری پہنے ہوئے تھے اور سر پر سفید پگڑیاں باندھے ہُوئے تھے جس پر سرخی کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں تلوار تھی اور پُشت پر ڈھال۔ دین کا نعرہ لگا کر ہمارے سامنے آئے اور حملہ آور ہونے سے پہلے ان کا سردار جو ایک بیس سال کا بے ریش و بروت نوجوان تھا، جس کی آنکھوں سے خُون ٹپک رہا تھا۔ صف سے آگے بڑھ کر ہم سے یُوں مخاطب ہُوا؛ "کیا تم کافروں میں کوئی شخص حوصلہ مند ہے جو میرا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اگر ہے تو سامنے آئے"۔ اس کی آواز پر ہماری صفوں میں سناٹا چھا گیا۔ کوئی نوجوان آگے نہیں بڑھا۔ ایک منٹ کے بعد پھر چیلنج دیا اور کہا "میں پانچ آدمیوں سے تنہا مقابلہ کر سکتا ہوں"۔ لیکن پھر بھی کوئی حرکت نہ ہوئی۔ آخر جھنجھلا کر اس نے تلوار میان سے باہر نکالی اور ہماری صفوں پر حملہ آور ہُوا۔ اس نے اس شدت سے حملہ کیا اور چشم زدن میں اٹھارہ سپاہیوں کو زخمی کرکے

ڈال دیا۔ اس کی بے نظیر شجاعت کمانڈنگ افسر اس قدر متاثر ہُوا کہ اس نے حکم دیا کہ اس نوجوان کو زندہ گرفتار کیا جائے۔ لیکن اس نے کہا تم زندہ شیر کو گرفتار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ زخمی ہو جانے کے باوجود جب کہ اس کے جسم کے ہر عضو سے خُون کے فوارّے نکل رہے تھے۔ اس نے دوبارہ اسی شدّت کے ساتھ حملہ کیا۔ جب کمانڈنگ افیسر نے یہ دیکھا کہ اگر اس کو قتل نہ کیا تو شاید ساری کمپنی (سو آدمی کی ایک کمپنی) کا صفایا کر دے گا۔ تو مجبوراً اس نے حکم دیا کہ سنگینوں سے خاتمہ کر دو۔ یہ حُکم سُن کر سپاہیوں نے اسے نرغہ میں لے کر اپنی سنگینیں بیک وقت اس کے سینہ میں پیوست کر دیں لیکن جب تک اس کی رُوح جسم میں باقی رہی وہ برابر اپنی تلوار کے جوہر دکھاتا رہا [1]

۹۳ ویں رجمنٹ کا سارجنٹ مچل لکھتا ہے "سکھ اور ہماری ہلکی کمپنی بے قاعدہ لڑائی کی شکل میں آگے بڑھی ... اور دفعتہً ۳۶۰ روہیلہ غازیوں کی ایک جماعت نے بہت زبردست دھاوا بول دیا .... کیمبل نے ۴۲ ویں کے آدمیوں کو ان سنگینوں سے حملہ کرنے کا حکم دیا۔ لیکن، مچل مزید لکھتا ہے۔" ایسا آسانی سے نہ ہُوا۔ غازیوں نے بے باک جوش میں حملہ کیا ....." [2]

مجاہدین نے فرنگی فوج پر بلائے ناگہانی کی طرح جھپٹے اور کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ مانڈے خاں، جنرل اسمٰعیل خاں، نواب ولی ولدخاں اور نواب تفضّل حسین نے سخت مقابلہ کیا۔ لیکن ایک سانحہ نے پانسہ دشمن کے حق میں بدل دیا۔ خان بہادر خان کے نئے بھرتی شدہ سپاہیوں کا ایک دستہ بھاگ کھڑا ہُوا اس سے مجاہدین

---

[1] العلم، جنگ آزادی نمبر ص ۸۴

[2] WILLIAM FORBES MITCHELL, REMINISCENCES OF THE GREAT MUTINY, 1857–59,(LONDON,1910)P254

جب ایک عام بھگدڑ مچ گئی[1] خان بہادر خان نے اُن کے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن مقدّر اچھا نہ تھا۔ ۶ مئی کو بریلی سرنگوں ہوگیا اور خان بہادر خان اور دیگر قائدین کو راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔

فرنگیوں نے اگرچہ ایک اہم فتح حاصل کی لیکن مجاہدین نے اپنی شکست میں بھی اپنی بہادری کے جھنڈے گاڑے۔ فرنگی اتنے خوفزدہ تھے کہ شہر کا رُخ نہ کیا کیونکہ انہیں خطرہ تھا کہ شہر کی مسلم آبادی زبردست مزاحمت کرے گی۔

خان بہادر خاں نے اپنے اہل و عیال کو پہلی بھیت روانہ کیا اور خود مولانا احمد اللہ شاہ کے پاس محمدی چلے گئے۔ مولانا کی شہادت سے مجاہدین میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ خان بہادر خاں اپنے پیارے رفیق کا انتقام لینے کے لئے پانچ ہزار جمعیت کے ساتھ پون کی طرف بڑھے۔ اہل فرخ آباد نے بھی اپنے جاں نثار بھیجے، جب کہ ولایت علی شاہ نے تین ہزار جاں باز روانہ کئے اس کے علاوہ نانا راؤ، بالا راؤ، علی خاں میواتی اور دیگر قائدین بھی اپنے اپنے سرفروشوں کے ساتھ روہیل کھنڈ آپہنچے۔ پون کا راجہ صورت حال سے گھبرا گیا اور فرنگیوں سے مدد طلب کی۔ لڑائی ہوئی تو مجاہدین سمٹ کر نیپال کی ترائی میں جمع ہوگئے۔ یہیں آخری معرکہ ہوا۔ سامانِ حرب اور نظم کے فقدان کے سبب اب پھر شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ پچاس ساٹھ ہزار کی تعداد تھی لیکن تربیت یافتہ سپاہی کم تھے بلکہ غالب تعداد اُن لوگوں کی تھی جو مختلف مقامات پر ناکام ہوئے اور سہارا ڈھونڈنے کے لئے ان کے پاس جمع ہوگئے تھے۔

خان بہادر خاں ایک جنگل میں روپوشی کے عالم میں امان دیئے جانے کی آڑ میں گرفتار کئے گئے۔ لکھنؤ لائے گئے جہاں کرنل بیرڈ نے بغاوت کا سبب پوچھا؛ جواب دیا کہ تم نے ہمارا ملک چھینا، فوج نے تمہارے خلاف بغاوت کی۔

---

[1] حیات حافظ رحمت خاں، الطاف علی بریلوی، ص ۳۶۳ بدایوں، ۱۹۳۳ء۔

ہمیں لوگوں نے مستحق سمجھ کر حاکم بنایا۔ کرنل موصوف نے استفسار کیا کہ عملداری انگریز قائم ہونے کے بعد ملک بخوشی کیوں نہ دیا؟ جواب دیا، سرکار بھی کسی ملک کو دیتی ہے؟

لکھنؤ سے بریلی پیدل پہرے میں مقید ہو کر لے جائے گئے جہاں پھانسی کے لئے شہر کے چوک میں لائے گئے۔ خلقت شہر کی جمع تھی، افسران بھی موجود تھے جلاد نے آپ کی مشکیں باندھ کر کپڑے اتارنے چاہے تو آپ نے اُسے منع کیا اور فرمایا کہ ان کا ایک ہاتھ کلکٹر اور دوسرا کمشنر تھام لے۔ المختصر پھانسی پر چڑھ کر سُرخرو ہو گئے۔ وُرثاء نے نعش طلب کی تو حکام نے جواب دیا کہ تم اسے شہید بنا کر قبر پر میلہ کیا کرو گے۔ لہٰذا قلعہ میں دفن کئے گئے[1]

آپ کی عظیم الشان کوٹھی ایک وسیع کھنڈر میں تبدیل کر دی گئی اور آپ کے ساتھ غداری کرنے والوں کو انعامات سے نوازا گیا۔ تفصیل ملاحظہ ہو۔

۱۔ ٹھاکر لاکھن سنگھ آف بدنیلی	خطاب راؤ بہادر، اعزازی مجسٹریٹ اور آٹھ ہزار روپیہ مالگزاری کی ریاست
۲۔ ٹھاکر رگھوناتھ سنگھ آف بدھیلی	پانچ ہزار روپیہ مالگزاری کی جائداد دوسروں کی ضبط کر کے دے دی گئی۔
۳۔ ٹھاکر ظالم سنگھ آف راج پور	دو ہزار روپیہ مالگزاری کی زمینداری
۴۔ بیج ناتھ مصرا	راجہ کا خطاب، تقریباً ۲۸ گاؤں محبانِ وطن کے ضبط
۵۔ لچھمی نرائن خوانچی	دو ہزار روپیہ کی مالگزاری کی زمینداری
۶۔ چودھری نوبت رام	دو ہزار روپیہ کی مالگزاری کی زمینداری
۷۔ گنگا پرشاد تحصیلدار بدایوں	بارہ سو روپیہ مالگزاری کی زمینداری۔ اس نے

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۳۶۹

ڈھونڈ ڈھونڈ کر محبانِ وطن کو پھانسی پر لٹکوایا۔

۸۔ ٹھاکر بختاور سنگھ آف مراد آباد — قصبہ شاہی کا تحصیلدار مقرر کیا گیا اور دو ہزار روپیہ مالگزاری کی زمینداری دی گئی۔

۹۔ شیخ بدر الدین — بارہ سو روپیہ مالگزاری کی زمینداری دی گئی یہ انگریزوں کے ساتھ نینی تال بھاگ گیا اور ہر طرح اُن کی مدد کی۔

خان بہادر خان پیکر شجاعت تھے۔ اسلامی حمیّت کے جذبے سے سرشار تھے۔ اگرچہ آپ کو حکومت کرنے کی بہت کم مُہلت ملی لیکن پھر بھی "خان بہادر خاں کے زمانہ حکومت میں پوُرا شہر ساری رات جاگتا رہتا تھا۔ بازار کھُلے رہتے، سڑکوں اور گلی کوچوں میں بڑی رونق اور چہل پہل تھی۔ مکمل امن وامان تھا۔ لوگ نواب کی انتظامی قابلیت اور رعایا پروری کے بڑے مداح تھے۔ مسجدیں، مسُافر خانے اور سڑکیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ امن وامان کی ڈونگی پٹتے ہی ہر چیز ارزاں ہو گئی تھی۔ تیل روپے کا پانچ سیر، گھی ڈھائی سیر اور گیہوں بیس سیر کے حساب سے فروخت ہو رہا تھا کوئی گھر ایسا باقی نہ تھا جس میں کوئی تقریب نہ ہوئی ہو۔ لوگ خوش ہو ہو کر ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے اور کہتے کہ خُدا نے اپنی رحمت سے کافروں کی حکومت سے ایسی نجات دلائی کہ ہر چیز میں برکت ہو گئی ہے۔ اسلحہ سازوں کی دوکانوں پر بڑی بھیڑ رہتی تھی۔ تلواروں پر دستے چڑھوائے جا رہے تھے۔ مجاہدوں کے غول کے غول زرہ بکتر سے لیس پوُرے شہر میں گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے اور اسلام کا بول بالا فرنگی کا مُنہ کالا کے نعروں سے زمین وآسمان ہل جاتے تھے۔" [1]

---

[1] العلم، جنگِ آزادی نمبر ص ۳۵

خان بہادر خان کو محض دس ماہ حکومت کرنے کا موقع ملا لیکن پھر بھی تعمیری ذوق مثالیں قائم کیں۔ اپنے دادا حافظ رحمت خاں کے مقبرہ کی مرمت کرائی محلہ بھوڑ میں قبرستان سے متصل ایک مسجد تعمیر کرائی۔ اعلیٰ پایہ کے مصنف بھی تھے ایک کتاب کا نام "مقاصد الصالحین" ہے۔ آپ شاعر بھی تھے۔ ایک غزل ملاحظہ ہو:

تا حشر اب خیال نہ میرا کرے گا دل
تو اس کو مل گیا تو مرا کیا کرے گا دل

جان و جگر تو نام کو باقی نہیں رہے
کیونکہ اب اس کی زلف سے سودا کریگا دل

جان و جگر کے واسطے دیکھو گے دوستو
کن کن خرابیوں کو نہ سوچا کرے گا دل

شانے کی طرح اور بھی ہووے گا چاک چاک
جیوں جیوں کہ اس کی زلف سنوارا کرے گا دل

معروف دیکھ پیروی دل نہ کیجیو!!
میری طرح سے تجھ کو بھی رسوا کرے گا دل

مولانا فضل حق خیر آبادی

فخرالفضلاء، ختم العلماء، امیرالدولہ مولانا فضل حق ۱۷۹۷ء (۱۲۱۲ھ) میں خیر آباد (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ آپ نہایت فاضل اجل اور عالم بے بدل بزرگ تھے۔ آپ خیر آباد کے مشہور عالم مولانا فضل امام کے جانشین، فرزند اور شاگرد تھے جو علماء عصر میں ممتاز اور علوم عقلیہ کے درجہ پر سرفراز تھے اور دہلی میں صدر الصدور کے عہدہ جلیلہ پر فائز اور دنیوی نعمتوں سے مالا مال تھے۔ نسباً آپ شیخ فاروقی تھے۔ علوم عقلی کی تحصیل اپنے والد سے کی۔ حدیث میں آپ حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔ قرآن حکیم کو چار ماہ کی قلیل مدت میں حفظ کیا۔ چودہ برس کی عمر میں ہی علوم مروجہ کی تحصیل سے فراغت پا چکے تھے۔ دور دراز سے لوگ آپ کے درس میں آتے تھے۔ ایک دفعہ آپ کے والد محترم نے سبق پڑھنے کے لئے ایک طالب علم کو آپ کے پاس بھیجا۔ طالب علم تھا غریب آدمی، بدصورت، عمر زیادہ علم کم، ذہن کند جب کہ مولانا نازک طبع، پروردہ جمالِ صورت و معنی سے آراستہ چودہ برس کا سن و سال، نئی فضلیت، ذہن میں جودت، تھوڑا سبق پڑھایا کر بگڑ گئے۔ اُس کی کتاب پھینک کر اُسے بُرا بھلا کہہ کر نکال دیا۔ اُس نے آپ کے والد محترم سے واقعہ گوش گزار کیا۔ جنہوں نے بلا کر ایک تھپڑ جڑ دیا، دستار دُور جا پڑی۔ طالب علموں کی قدر و منزلت پر پورا لیکچر دیا اور آئندہ ایسی حرکت سے پرہیز کی تلقین کی[1]

---

[1] تذکرہ عوثیہ ص ۱۳۶ ـ ۱۳۷

اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ریذیڈنٹ کے محکمہ کے سررشتہ دار مقرر ہوئے۔ موجودہ ملازمت ترک کردی۔ نواب فیض محمد خاں رئیس جھجر نے پانچ صد روپیہ ماہوار مصارف کے لئے پیش کیا اور قدر دانی کے لئے اپنے پاس بلا لیا۔ روانگی کے وقت ولی عہد ابوظفر نے اپنا ملبوس دوشالہ اوڑھا دیا کہ اُن کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے اور قلعہ میں آتے جاتے تھے۔ ولی عہد بوقت وداع آبدیدہ ہوگئے اور یہ شعر پڑھا:

شمائے گوئید کہ من رُخصت مے شوم مراجز ائیکہ
پذیرم گزیر نیست، اما ایز دوانا، داند کہ لفظ وداع

ایک عرصہ تک جھجر میں رہے پھر مہاراجہ الور کی دعوت پر اُن کے ہاں چلے گئے کچھ دن سہارن پور قیام کرنے کے بعد والی رام پور یوسف علی خاں کے پاس چلے گئے جہاں محکمہ نظامت اور مرافعہ عدالتوں میں منسلک ہوئے۔ کوئی دس برس بعد لکھنؤ اٹھ آئے جہاں صدر الصدور مقرر ہوئے۔ ۱۸۴۸ء میں واجد علی شاہ نے "حضور تحصیل" کے نام سے ایک کچہری مقرر کی جس کے مہتمم مولانا ہی قرار پائے۔ یہ عدالت کمپنی کے ملازم سپاہ کی زمینداری کے متعلق مقدمات کا فیصلہ کیا کرتی تھی[1]

جنگ آزادی کے آغاز پر فوراً دہلی پہنچے اور جامع مسجد میں تقریر کی جس میں فتویٰ دیا کہ انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں حصہ لینا فرض ہے۔ آپ نے متعدد والیانِ ریاست اور اُمراء کو اس تحریک میں آزادیٔ وطن کا واسطہ دے کر شامل کرنے کی کوشش کی، ان میں بھرت پور اور الور کی ریاستیں قابلِ ذکر ہیں۔ خود جنرل بخت خاں سے ملے اور اُن کی ہر طرح امداد و اعانت کی۔

دہلی کی تسخیر کے بعد اودھ چلے گئے۔ پانچ یوم تک بھوکے پیاسے مکان کے اندر بند رہے۔ پانچویں روز اہل وعیال اور ضروری سامان لے کر شب میں

---

[1] تاریخ اودھ جلد چہارم، ص ۲۷، نجم الغنی خاں رامپوری

چھُپ کر نکلے، دریا عبُور کئے، میدان قطع کئے، پھر بھیکن پور ضلع علی گڑھ میں اٹھارہ روز رہے۔ جب ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے اعلانِ عفوِ عام ہوا تو اپنے وطن خیر آباد چلے گئے لیکن گرفتار ہو گئے۔ پہلے آپ کو سیتا پور، پھر لکھنؤ لایا گیا۔ عدالت میں پیش ہُوئے تو آپ کی شخصیّت کا مُخبر پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے کہہ دیا کہ آپ متعلقہ فرد نہیں ہیں۔ لیکن مولانا نے خود اپنے آخری بیان میں کہا کہ: مُخبر نے خبر نہیں کس وجہ سے میری شناخت نہیں کی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں ہی وُہ شخص ہوں جس نے وہ فتویٰ دیا تھا اور اب بھی میری وُہی رائے ہے۔“

جُرم ثابت ہو جانے پر حبسِ دوام بہ عبُورِ دریائے شور کی سزا دی گئی۔ آپ کی سزا آپ کی جبیں پر داغ دی گئی۔ قید کے ایّام پورے کرنے کے لئے آپ کو انڈیمان پہنچا دیا گیا۔ خیر آباد کا دیوان خانہ اور محل سرا ضبط کر کے بہ صلہ خیر خواہی سردار محمد ہاشم سیتا پوری کو دے دیئے گئے۔ انڈیمان میں مولانا پر جو کچھ گزری، خود اُن کی زبانی سُنیئے۔

”مجھے دریائے شور کے کنارے ایک بلند و مضبوط ناموافق آب وہوا والے پہاڑ پر پہنچا دیا جہاں سورج ہمیشہ سر پر ہی رہتا تھا۔ اس میں دشوار گزار گھاٹیاں اور راہیں تھیں جنہیں دریائے شور کی لہریں ڈھانپ لیتی تھیں۔ اس کی نسیمِ صُبح بھی گرم تیز ہوا سے زیادہ سخت اور اس کی نعمت زہرِ ہلاہل سے زیادہ مُضر تھی۔ اس کی غذا حنظل سے زیادہ کڑوی، اس کا پانی سانپوں کے زہر سے بھی بڑھ کر ضرر رساں تھا۔ اس کا آسمان غموں کی بارش کرنے والا، اس کی زمین آبلہ دار، اس کے سنگریزے بدن کی پھنسیاں اور اس کی ہوا ذِلّت خواری کی وجہ سے ٹیڑھی چلنے والی، ہر کوٹھڑی پر چھپر تھا جس میں رنج و مرض بھرا ہُوا تھا۔

”ہوا بدبُودار اور مرض کا مخزن تھی۔ مرض سستا اور دوا گراں،

بیماریاں بے شمار، خارش و توباد زدہ مرض جس سے بدن کی کھال پھٹنے اور چھلنے لگتی ہے عام تھی .... جب کوئی ان میں سے مرجاتا ہے تو نجس و ناپاک خاکروب جو درحقیقت شیطان خناس یا دیو ہوتا ہے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچتا ہوا غسل وکفن کے بغیر اس کے کپڑے اتار کر ریگ کے تودے میں دبا دیتا ہے، نہ اس کی قبر کھودی جاتی ہے نہ نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے۔ یہ کیسی عبرتناک اور الم انگیز کہانی ہے۔

میرے دشمن میری ایذا رسانی میں کوشاں اور میری ہلاکت کے درپے رہتے ہیں، میرے دوست میرے مرض کے امداد سے لاچار ہیں دشمنوں کے دل میں میری طرف سے بغض و کینہ مذہبی عقائد کی طرح راسخ ہوگیا ہے۔ ان کے پلید سینے کینہ و عداوت کے دفینے بن گئے ہیں۔"[1]

مولانا کے فرزند مولانا عبدالحق اور منشی غلام غوث بیخبر نے آپ کے مقدمہ کی پیروی جاری رکھی اور بالآخر رہائی کے احکامات حاصل کر لئے۔ لیکن جس وقت احکامات پہنچے اس وقت مولانا کا جنازہ نکل رہا تھا۔ د ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء بمطابق ۱۲ صفر المظفر ۸، ۱۲ھ)[2] انڈیمان میں ہی سپرد خاک ہوئے۔ غالب نے تاریخ وفات یوں بیان کی ہے۔

---

[1] الثورۃ الہندیہ بحوالہ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد ص ۸۹۲ - ۸۹۴

[2] حیات شبلی از سید سلیمان ندوی حاشیہ ص ۸۰ : روختہ الادباء، مولوی محمدالدین مطبع انجمن پنجاب لاہور۔ ۱۸۷۹ء، ص ۱۴۸ - ۱۴۹، غدر کے چند علماء، مفتی انتظام اللہ شہابی، ص ۴۵

گفتم اندر سایہ مُطف بنی
باد آرا مشکۂ فضل امام

۱۲۴۰ھ

نواب ضیاء الدین خان نے جو تاریخ کہی ہے، اس میں ایک سال کا فرق ہے
اور وُہ غلط ہے ع

فضل حق مرد والے — سال وفات

۱۲۷۹ھ

مشہور شاعر مُنیر شکوہ آبادی، مولانا کے ساتھ ہی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے، کس حسرت سے کہتے ہیں۔

مولوی، بے نظیر فضل حق اسم شریف — دہلی سے تا لکھنؤ مشتہر و موتمن
قید میں، مَیں اور وہ رہتے تھے ایک ہی جگہ — عین سمندر میں تھے غرقۂ بحر محن
نصف قصیدہ کیا سامنے اُن کے رقم — ختم ہوا جب تھے وہ ہمدم گور و کفن

مولانا فضل حق امیر و کبیر شخص تھے۔ زندگی کے ہر شعبے کے لوگ آپ کی عزت کرتے تھے۔ خسروانہ زندگی بسر کی تھی۔ ہاتھی، گھوڑے، پالکی اور دوسری شان و شوکت کی سواریاں ہر وقت دروازے پر موجود رہتیں۔ ان کے فرزند عبدالحق کی پیدائش پر دہلی کے خواص و عوام اور برادرانِ وطن نے بھی بطور اظہار خوشی کے نذرانے اور تحفے لاکھوں روپے کے پیش کئے۔ بیٹے کے لئے پُر شکوہ حویلی تیار کرائی جس کے لئے پتھر آگرہ اور دوسرے شہروں سے منگوائے گئے۔ فرنگیوں نے مولانا فضل حق کا کتب خانہ ضبط کر لیا تھا لیکن جب ان کے فرزند مولانا عبدالحق کو ۱۲ فروری ۱۸۸۷ء کو لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند نے شمس العلماء کا خطاب دیا تو ضبط شدہ دیہاتوں میں سے کچھ واگزار کئے۔ مولانا فضل حق کی صاحبزادی بی بی سعید النساء، جو مضطر خیرآبادی کی والدہ تھیں، بڑے پایہ کی شاعرہ تھیں اور حرمان تخلص فرماتی تھیں۔

منشی صدرالدین آزردہ صدرالصدور دہلی آپ کے ہم جماعت اور امام بخش صہبائی، مومن خاں مومن اور اسد اللہ خاں غالب، نواب ضیاء الدین، محمد ابراہیم ذوق جیسے باکمال شعرا اور ادیب آپ کے گہرے دوست تھے۔ مولانا فرقتی تخلص رکھتے تھے۔ ایک روز آپ نے امراء القیس کے قصیدہ پر عربی میں قصیدہ کہا اور مولانا شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں پیش کیا۔ شاہ صاحب نے ایک مقام پر اعتراض کیا۔ اس کے جواب میں مولانا نے بیس شعر متقدمین پڑھ دیئے آپ کے والد بزرگوار نے ادب ملحوظ خاطر رکھنے کو کہا تو جواب دیا کہ یہ کوئی علم تفسیر و حدیث تو ہے نہیں، فن شاعری ہے۔ اس میں بے ادبی کا کونسا پہلو نکلتا ہے؟ شاہ صاحب نے کمال شفقت سے فرمایا کہ برخوردار تو سچ کہتا ہے مجھ کو سہو ہوا تھا[1]

اختلاف مسلک کے باوجود مولانا فضل حق شاہ اسمٰعیل شہید کا دلی احترام کرتے تھے۔ عمر کا تفاوت، فضل و کمال میں فیضیابی اور محضر الذکر کا خلوص اس احترام کے عناصر ثلاثہ تھے۔ مولانا فضل حق کے ایک شاگرد مولوی فضل عبدالرشید غازی پور تھے۔ ایک دفعہ اُن کے ایک دوست نے اُن سے کہا کہ تم تو شاہ اسمٰعیل کے معتقد ہو جب کہ تمہارے استاد اُن پر تبرا بولتے ہیں، آؤ آج تمہیں سنواؤں۔ دونوں مولانا کی مجلس میں آئے اور مولوی فضل عبدالرشید نے وجہ آمد بتائی۔ مولانا سخت ناراض ہوئے اور فرمایا میں اور مولانا اسمٰعیل پر تبرا کروں، یہ نہیں ہو سکتا اور یہ کہہ کر اُن کو اپنی مجلس سے اُٹھوا دیا اور فرمایا کہ میرے یہاں کبھی نہ آنا[2]

اپنے لکھنو کے قیام میں صدرالصدور کے منصب جلیلہ پر فائز ہونے کے

---

[1] تذکرۂ غوثیہ ص ۱۳۶ - ۱۳۷

[2] امیر الروایات ص ۱۶۱

باوجود درس وتدریس سے ناطہ نہ توڑا۔ مولوی رحمت علی خاں تذکرہ علمائے ہند میں اپنا مشاہدہ لکھتے ہیں: "میں نے ۱۲۶۴ھ میں بمقام لکھنؤ مولانا کو دیکھا کہ حقہ نوشی کی حالت میں شطرنج بھی کھیلتے جاتے تھے اور ایک طالب علم کو اُفق المبین کا درس اس خوبی سے دیتے تھے کہ مضامین کتاب طالب علم کے ذہن نشین ہوتے جاتے تھے۔" [1]

مولانا کی مومن سے بھی گہری چھنتی تھی۔ ایک دفعہ دونوں محو شطرنج تھے کہ مولانا نے ایک تحریر مولانا محمد اسمٰعیل کے پاس بھیجی۔ مولانا محمد اسمٰعیل کا دستور یہ تھا کہ فوراً ہی جواب دے دیتے۔ لیکن اس دن جواب ندارد تھا اور کسی دوسرے دن جواب کا وعدہ ملا۔ مولانا فضل حق نے کہا "بس دے لیا جواب"۔ یہ بات مومن خاں کو ناگوار گزری اس لئے مزاج مکدر ہونے کے باعث یہ شعر کہہ کر چل دیئے۔

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال دیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

آرزو مولانا فضل حق کا تخلص تھا۔ مولانا مومن کو منانے کے لئے تشریف لے گئے۔ کچھ گفتگو ہوئی پھر صلح ہوگئی۔ اس وقت مومن خاں نے یہ شعر پڑھا:

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہوگئے ناچار جی سے ہم

مولانا ایک یگانۂ روزگار عالم تھے۔ عربی زبان کے مسلّمہ ادیب اور شاعر تھے۔ علوم عقلی کے امام اور مجتہد تھے۔ معقولات میں نئی رُوح پھُونکی اور منطق کو مُلک میں از سرِ نو رواج دیا۔

عربی و فارسی میں نظم وائق ونثر فائق لکھتے تھے۔ چند ممتاز تصنیفات

---

[1] غدر کے چند علماء ص ۳۸

درج ذیل ہیں :-

۱ :- رسالہ بجنس الغالی فی شرح جوہر العالی
۲ :- حاشیہ شرح مُسلّم قاضی مبارک
۳ :- حاشیہ اُفق المبین
۴ :- رسالہ تحقیق الاجسام
۵ :- رسالہ الہیات
۶ :- حاشیہ تلخیص الشفاء
۷ :- ہدیہ سعیدیہ حکمت طبیعہ
۸ :- رسالہ روض المسجود فی تحقیق حقیقتہ الوجود
۹ :- رسالہ تحقیق الکلی الطبیق
۱۰ :- رسالہ تحقیق العلُوم والمعلُوم
۱۱ :- التشکیک
۱۲ :- تاریخ فتنہ ہندوستان

چار ہزار اشعار آپ کے شمار کئے گئے ہیں اور اکثر قصائد مدح رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم اور ہجو کُفار میں ہیں۔ سر سیّد احمد خاں نے "آثار الصنادید" اور منشی امیر احمد مینائی نے " انتخاب یادگار" میں آپ کے عربی قصائد کا انتخاب درج کیا ہے۔ کُنج قفس میں الثورہ الہندیہ (باغی ہندوستان) تحریر کی۔ یہ رسالہ آپ نے پھٹے پُرانے کاغذات اور کپڑوں پر کوئلہ وغیرہ سے لکھ کر اپنے فرزند مولانا عبدالحق کے پاس بدست مُفتی عنایت احمد کاکوری بھیجا۔ مُفتی صاحب نے انگریز افسر کی فرمائش پر تقویم البلدان کا ترجمہ کر کے ،،۱۲ھ میں رہائی پائی تھی۔

یہ مولانا کے تدبر، معاملہ فہمی اور دُور بینی ہی کا اثر تھا جس نے تحریک آزادی کو ایک مُلک گیر تحریک بنا دیا۔ اس راہ میں لرزہ خیز شدائد برداشت کئے مگر زبان حرفِ شکایت سے آشنا نہ تھی۔ تحریک کے خاتمہ پر نہ جانے کتنے

سورما اور رزم آراء ایسے تھے جو گوشۂ عافیت کے متلاشی تھے لیکن آپ زُود پشیمان نہ تھے۔ عدالت میں مقدمہ کے دوران میں مُخبر کی عدم شناخت کے باعث بچ سکتے تھے لیکن آپ اپنے اقدام وعمل کے نتائج بھگتنے کے لئے حوصلہ مندی اور دلیری کے ساتھ تیار تھے۔

مولانا ایک عظیم سیاستدان، مفکّر اور مدبّر تھے۔ انگریزوں کی خدمت کے اندیشے کی بنا پر ہندو مُسلم اتحاد کے زبردست علمبردار تھے۔ جب لکھنؤ میں تھے تو اجودھیا کی مسجد کا سانحہ پیش آیا تھا۔ اس کی بازیافت کے لئے مولانا سیّد امیر علی شہید اپنے چند جاں نثاروں کے ساتھ جہاد کی غرض سے نکلے تھے۔ مولانا فضل حق نے اس اقدام کی مخالفت کی تھی۔ اسی طرح تحریک کے آغاز پر آپ نے فتویٰ دیا کہ گاؤکشی بند کرادی جائے۔ اس فتویٰ کی توثیق بہادر شاہ ظفر کے فرمان نے بھی کر دی جن کو آپ کی بصیرت پر بڑا اعتماد تھا۔ اسی وجہ سے آپ کا دربار میں بھی آنا جانا تھا۔ ضلع گوڑگانواں کی بدنظمی کو فرو کرنے کی ذمّہ داری بھی بہادر شاہ ظفر نے آپ کو ہی سونپی تھی۔

سر سیّد احمد خاں نے ان الفاظ میں مولانا کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے :" یہ حضرت خلف الرشید ہیں جنابِ مولانا فضل امام کے۔ زبانِ قلم نے ان کے کمالات پر نظر کر کے فخرِ خاندان لکھا ہے اور فکرِ دقیق نے جب سرکار کو دریافت کیا، فخرِ جہاں پایا، جمیع علوم وفنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق وحکمت کی تو گویا انہیں کی فکرِ عالی نے بنا ڈالی ہے۔ علمائے عصر بل فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس سرکردہ اہلِ کمال کے حضور میں لبساطِ مناظرہ آراستہ کرسکیں۔ بارہا دیکھا گیا کہ جو لوگ اپنے آپ کو یگانۂ فن سمجھتے تھے، جب ان کی زبان سے ایک حرف سُنا، دعویٰ کمال کو فراموش کر کے نسبت شاگردی کو اپنا فخر سمجھے"[1]

---

[1] تذکرہ اہل دہلی، سر سیّد احمد خاں، ص ۸۸

محمود خاں

نجیب خاں محمود خاں کے دادا کے والد تھے۔ یہ وُہی سپُوت ہے جنہیں بریلی کے حاکم حافظ رحمت خاں نے ساتھ ملا کر احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملے کی دعوت دی تھی۔ ۱۷۵۴ء میں عالمگیر ثانی نے تخت نشینی کے بعد اُسے نجیب الدولہ اور امیر الامراء کے خطابات سے نوازا تھا۔ ۱۷۵۵ء میں انہوں نے قلعہ پتھر گڑھ کی تعمیر کی اور ضلع بجنور میں نجیب آباد بسایا۔ اس طرح ریاست نجیب کو نجیب الدولہ نے عزت بخشی۔ ۱۷۷۰ء میں فوت ہوئے۔ اُن کے بیٹے ضابطہ خاں نے اُن کی جگہ لی اور اُن کے بعد اُن کے بیٹے غلام قادر خاں نے اقتدار سنبھالا۔ سر سید احمد خاں کا بیان ہے کہ انہوں نے شاہ عالم کو اندھا کر دیا۔ مہاراجہ پٹیل نے اس جُرم میں مقابلے کے بعد گرفتار کر کے ایک آہنی پنجرے میں بند کر دیا اور بعد میں ایک ایک عضو کاٹ کر ہلاک کیا۔

محمود خاں نجیب الطرفین یوُسف زئی روہیلہ پٹھان تھے۔ نجیب آباد کی کوٹھی "مبارک محل" میں پیدا ہوئے۔ اس محل اور دیگر متعلقہ عمارات کے متعلق مصنف نجیب التواریخ رقم طراز ہے۔

" راقم نے قبل از غدر جب کہ میری عمر سولہ برس کی تھی سیر قلعہ اور مہتاب باغ کی تھی اور جس احاطہ میں تحصیل نجیب آباد اور تھانہ پولیس واقع ہے، وُہ محل سرائے نواب کی تھی۔ دروازہ نہایت عجیب اور باشوکت تھا۔ باغ میں ایک مکان مچھی بھون تھا۔ ایام گرما میں اس کی چھت سے باریک بُوندیں بارش کی سی برسائی جاتی تھیں۔"

نواب معین الدین عرف بھنو خاں آپ کے والد تھے انہوں نے آپ کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا۔ جب آپ سنِ شعور کو پہنچے تو علاقے کا انتظام آپ کے سپرد کیا۔

۱۹ مئی، ۱۸۵۷ء کی شام نواب محمود خاں کوئی ساٹھ ستر پٹھان بندوقچیوں کی معیت میں بجنور پہنچے جہاں جیل لوٹنے کا واقعہ پیش آیا تھا اور انگریز کلکٹر نے جملہ رئیسانِ ضلع کو بجنور میں مع کمک کے طلب کیا تھا۔ اُدھر نجیب آباد کے حالات دگرگوں ہو رہے تھے۔ اس لئے محمود خاں واپس لوٹنے کے لئے بے چین ہوئے۔ ضلعی انتظامیہ نے روکنے کی بہت کوشش کی مگر دو روز بعد لوٹ گئے۔ ۵ جون کو جب نجیب آباد میں علمِ جہاد بلند ہوا تو محمود خاں نے اپنی فرماں روائی کا اعلان کر دیا۔ اس وقت سر سیّد احمد خاں کا انگریز دوست سکیپر ضلع کا کلکٹر تھا۔ سر سیّد احمد خاں صدر امین اور رحمت علی ڈپٹی کلکٹر تھے، ان تمام نے از خود ضلع کا انتظام نواب موصوف کے حوالے کر دیا[1]

کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ کلکٹر نے درج ذیل خط نواب صاحب کو دیا جسے سر سیّد احمد خاں نے لکھا اور سیّد تراب علی تحصیلدار کی موجودگی میں دیا۔ موسومہ نا محمود خاں از طرف جنابِ صاحب کلکٹر بہادر مرقومہ شب مابین ہفتم و ہشتم جون چوکہ بالفعل انتظام ضلع بجنور کا جب تک کہ سرکار کی مرضی ہو آپ کے سپرد ہوتا ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ ضلع کا انتظام بخوبی کرو اور جس قدر اسباب جنابِ صاحب کلکٹر بہادر اور جناب صاحب جنٹ مجسٹریٹ بہادر کا کوٹھی میں ہے اور جس قدر مال و اسباب دفتر سرکاری میں ہے۔ اس کی بخوبی حفاظت رکھو۔ مرقوم ساتویں جون، ۱۸۵۷ء۔ جس وقت یہ کاغذ تحریر ہوا اُس وقت ۱،۵۵،۰۷۹ روپے ۹ آنے ۷ پائی خزانے میں تھے۔

---

[1] ۱۸۵۷ء، غلام رسول مہر، ص ۲۹۶

۷ جون کی شب فرنگی مرد اور عورتیں ہاتھیوں پر سوار ہو کر میرٹھ روانہ ہوگئے۔
اگلی صبح نواب محمود خاں نے "خلق خُدا کی، مُلک بادشاہ کا، حُکم نواب محمود خاں کا" کی منادی کرادی۔ سر سیّد احمد خاں کو آزاد حکومت میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔ اور ایک جاگیر کی بھی پیش کش کی گئی مگر انہوں نے انکار کر دیا اور نواب صاحب سے کہا "خدا کی قسم! نواب میں صرف تمہاری خیر خواہی کے لئے کہتا ہوں کہ تم اس ارادے کو دل سے نکال دو۔ حُکّام انگریزی کی عملداری نہیں جائے گی۔"

جنگ آزادی کے وقت سر سید احمد خاں بجنور کے صدر امین تھے اور انگریزوں کی حکومت کے زبردست حامی تھے اور اُن کو پناہ بھی دیتے تھے۔ نواب صاحب کے لئے اُن کی یہ حرکت سخت ناپسندیدہ تھی۔ سر سید احمد خاں نواب صاحب کو اس حد تک ناپسند کرتے تھے کہ انہوں نے اپنی تحریروں میں جگہ محمود خاں کو "نامحمود خاں" لکھا ہے۔ ڈپٹی کلکٹر رحمت خاں نے بھی انگریزوں سے حق وفا ادا کیا اور خفیہ و اعلانیہ ایسی سرگرمیاں جاری رکھیں جن سے نواب صاحب کی حکومت کو نقصان پہنچا۔ پٹھانوں اور راجپوتوں کی آزاد و مشترکہ حکومت ختم کروانے کے لئے ہندو بغاوت کا انتظام کیا اور پچاس ہزار روپیہ اس مقصد کے لئے انگریزوں نے کپتان گودانی کو دیا مگر وہ اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ پھر بھی مختلف مقامات کے ہندو رؤسا نواب صاحب کے خلاف صف آراء ہوگئے۔ انجام کار سب نے نواب صاحب کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔

نواب صاحب نے رسد کی فراہمی کے سلسلہ میں تحصیلداروں اور تعلقہ داروں کے نام احکامات جاری کئے۔ چوہدری پرتاب سنگھ رئیس تاج پور کے نام اس طرح لکھا:
"رفعت و عوالی مرتبت عزیز القدر چوہدری پرتاب سنگھ رئیس تاجپور بخیریت ہو جو یہ اطلاع اور چلٹن مرادآباد کے پروانہ جات بنام تحصیلدار چاند پور، دھام پور وغیرہ دربارۂ انتظام فراہمی رسد وغیرہ فرودگاہ لشکر پر جاری ہوئے ہیں۔

لہٰذا تم کو لکھا جاتا ہے کہ تم بھی جسقدر ہو سکے دربارۂ انتظام دے دینے رسد وغیرہ کے ممد ومعاون ان کے رہو، تاکید جانو۔ مرقوم، ا جون، ۱۸۵۷ء"

نواب صاحب نے بہادر شاہ ظفر سے بھی فرمان حاصل کرنے کے لئے ۲۸ جون، ۱۸۵۷ء کو ممدو خاں کو عرضی دے کر دہلی بھیجا جو درج ذیل فرمان لے کر واپس آیا۔ اس کے ساتھ لالہ متھرا داس پدر لالہ نانکے رائے خزانچی بھی تھا۔

فرمان بادشاہی مورخہ ۲۸ ذیلقعدہ سنہ ۲۱ جلوس بمطابق ۲۱ جولائی، ۱۸۵۷ء

۱۲۷۳
محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی
ابو ظفر سراج الدین

فدوی خاص لایق العنایت والاحسان امیر الدولہ ضیاء الملک محمد محمود خاں بہادر مظفر جنگ مورد تفضیلات بودہ بداند عرضداشت ارادت سمات آں فدوی خاص مشعر ظہور ابتری و بے نظمی در کل پرگنات و دیہات آں ضلع از شورش وفساد غارت گراں و مفسداں و تدبیر انتظام آں بہ فراہمی جمعیت سوار و پیادہ بقدر تاب و توان و عرض احوال رسوخ عقیدت و ثوق ارادت موروثی در بارگاہ خسروی بہ استدعا بذل توجہات شاہی در خصوص انتظام آں ملک بدستور سلف بملاحظہ قدسی گذشت و کاشف معروضات گشت فی الواقع آباؤ اجداد آں فدوی خاص ہمہ مورد نوازشات سلاطین پیشین انار اللہ برہانہم بودہ اند و مخصوص آں لایق العنایت والاحسان در رضاجوئی و خدمت گزاری فرہ باصرہ خلافت مرزا شاہ رخ بہادر مرحوم دقیقہ فرد گذاشت نہ کردہ باعث رضامندی خاطر گردیدہ بود نظر براں مستحق رعایت وعنایت است ولیکن در اسے خدمت سابقہ اگر فی الحال مصدر حسن خدمتی خواہد گشت مورد مزید الطاف بادشاہی خواہد گردید درخواست آں فدوی خاص کہ عبارت از اجازت انتظام کلی آں ضلع است برہنہ پذیرائی خواہد رسید پس تا وقتیکہ از پیشگاہ قدسی سند

مستند شرف اجرا نیابد جملہ محاصل ملکی را بعد وضع مصارف فوج و عملہ تحصیل بطریق امانت تصور باید کرد و بار سال آں در حضور فیض گنجور باید برداخت و نیز در خطیر خزانہ کلکٹری واسباب و اسپاپش کہ بعد فرار انگریزان بہ قبضہ خود درآوردہ ہمہ مع فرد واصل باقی آں بہ جمعیت منفرداوس دو و سوار ملازم بادشاہی کہ دانجا میرسند زود تر روانہ نماید تا نقد فدویت و ارادت آں فدوی خاص بہ محک امتحان کامل بر آید و ظہور ایں گونہ دولت خواہی و خیر اندیشی وسیلہ ترقی مدارج و مراتب گردد۔

فقط

المرقوم ۲۸ ذیقعدہ سنہ ۱۲ معلّٰی

نواب محمود خاں نے ضلع کا انتظام چلانے کے لئے ایک کونسل مقرر کی۔ عظمت اللہ خان ٹھاکر دوارہ کو اپنا نائب اور احمد اللہ تحصیلدار نجیب آباد کو ڈپٹی کلکٹر مقرر کیا۔ احمد یار خاں عرف کلن خان سپہ سالار اور حبیب اللہ خان بخشی فوج مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ درج ذیل حکمنامہ لکھا:

"روبکاری محکمہ بہ اجلاس امیر الدولہ ضیاء الملک ذوی القدر نواب محمد محمود خاں مظفر جنگ واقعہ ۱۲ ستمبر ۱۸۵۷ء چونکہ ایں جانب بہ سبب بدانتظامی ضلع بجنور کے محمد احمد اللہ بہادر محمد احمد یار خاں و محمد شفیع اللہ خاں و آخوندزادہ عبد الرحمٰن خاں و سید احمد خاں کو بہ نظر رفاہ خلائق اور واسطے انتظام مالی و ملکی ضلع بجنور کے اپنی طرف مختار کار عام مقرر کیا اور کل انتظام ضلع کا سپرد صاحبان مرقومہ بالا کے کیا تو ضرور ہے کہ جو معاملات ہیچ انتظام ملک خواہ پروانہ جات و چٹھیات و رقعہ جات یا اور کوئی امر متعلقہ نظامت و فوجداری اجرا پاوے تو بصلاح مشورہ صاحبان مرقومہ بالا کے تجویز ہو کر روبروایں جانب پیش ہووے اور ایک عرضی بھی سب صاحبان کی طرف سے مشعر بہ اطلاع اتفاق رائے کے گزرنی چاہیئے تو اس وقت ہونا حکم منظوری تجویز یا دستخط ایں جانب مناسب ہوگا۔

لہٰذا حکم ہوا۔

جو امر تجویز صاحبان مرقومہ بالا سے اجرا پاوے تو بالاتفاق سب صاحبوں

کے تجویز ہو کر مع قطعہ عرضی کے ہمارے روبرو پیش ہو، جب دستخط اور حکم ہمارا ہو گا اور درصورت خلاف رائے صاحبوں کے کوئی امر تجویز کیا ہوا کسی کا قابل پذیرائی کے نہ ہو گا۔ اطلاعاً نقل روبکار ہذا کی پاس ان پانچوں صاحبوں کے بھیجی جاوے۔ اصل روبکار سررشتہ میں رہے۔"

لیکن، جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ، سر سید احمد خاں، سید تراب علی تحصیلدار اور پنڈت رادھا کشن ڈپٹی انسپکٹر کو بدستور کام کرنے کو کہا تھا لیکن وہ لوگ نہ مانے اور نواب صاحب کے احکامات کو نظر انداز کرنے کے علاوہ یہ تاثر بھی دیتے رہے کہ انگریز جلد لوٹ آئیں گے۔

نواب صاحب کی سپاہ ملازم تنخواہ داروں پر مشتمل تھی اور بیشتر پٹھان ہونے کے ناطے اچھے نشانہ باز بھی تھے۔ ہلدور کے دوسرے معرکے کے بعد تمام ضلع پر نواب صاحب کا اقتدار قائم ہو گیا تو آپ نے اپنی مہروں پر واللہ ملک السموٰت والارض کے الفاظ کندہ کرائے۔ سنہ عیسوی کے بجائے سنہ ہجری اور ضلع بجنور کے حکومت نجیب آباد لکھا گیا۔ نواب صاحب کے شکوہ و تجمل اور طنطنہ نے مقامی رؤسا کو اندیشہ ہائے دور و دراز میں مبتلا کر دیا۔ انگریزوں نے اور شہ دی۔ لیکن نواب صاحب کشت و خون نہ چاہتے تھے۔ اسی لیے آپ کے ایک معتمد سعد اللہ خاں تحصیلدار نگینہ چودھریوں سے صلح صفائی کرنے کی غرض سے نہٹور گئے مگر چودھریوں نے صلح نہ کی۔ ۱۸ ستمبر کو ہلدور کے چودھری نواب صاحب کی سپاہ سے لڑے لیکن منہ کی کھائی۔

نواب صاحب نے چودھری پرتاب سنگھ اور چودھری امراؤ سنگھ رئیس شیر کوٹ کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ ۲۶ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دونوں کی ملاقات نواب صاحب سے ہوئی۔ دونوں نے آپ کی خدمت میں کچھ اشرفیاں نذر کیں جبکہ نواب صاحب نے ایک دوشالہ بطور خلعت ان کو عنایت کیا۔ لیکن انگریزوں کے وفاداروں کی یہ کوشش تھی کہ نواب صاحب اور ہندو رؤسا کے درمیان

جو اتحاد قائم ہوا ہے وہ ٹوٹ جائے۔ بالآخر یہ رخنہ انداز یاں کامیاب ہوئیں۔ یہ وفادار اپنی کارگزاریوں کی اطلاع انگریزوں کو بھی دیتے رہتے تھے۔ وہاں سے آیا ہوا ایک "عنایت نامہ" ملاحظہ ہو۔

رفعت و عوالی مرتبت گرامی قدر چودہری امراؤ سنگھ صاحب سلمہ الرحمٰن

عرضی آپ کی مشعر حالات ظلم اور بدعت نواب محمود خاں کے پہنچی۔ سب حال معلوم ہوا۔ کمال افسوس و رنج ہے کہ آپ کا اس قدر نقصان عظیم ہوا اور شیوراج سنگھ اور قبیلہ اس کا قتل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کوئی آفت کسی پر نازل نہیں کرتا جس کے بعد کچھ تسلی نہ ہو۔ اگر اس قدر ظلم یعنی غارت گری مال و قتل عزیزان تمہارا پٹھان لوگ نہ کرتے تو تم سب روسائے ہنود یکدل ہو کر کیونکہ اس کو نکالتے۔ اب تم سب ہنود نے اتفاق کر کر اس ظالم نواب کو نکال دیا۔ اگر سابق سے بھی تمہارے باہم ایسا اتفاق ہوتا تو جس قدر فوج باغی اس نواح میں تھی اس کا مارا جانا کیا مشکل ہوتا اور پھر کیا ضرورت چلے آنے کی ہم لوگوں کو وہاں سے ہوتی، اور ایسے آفات تم لوگوں پر کیوں آتے۔ خیر سب امور اپنے وقت معینہ پر منحصر ہیں۔ اب بفضلِ خدا سب تکالیف تمہاری جلد رفع ہو جاتی ہیں۔ بہ طلب ہماری جو آپ لکھتے ہیں سو ہم نے واسطے جانے بجنور کے گورنمنٹ کو لکھا اور شکپیئر صاحب بھی پہاڑ سے بلائے گئے ہیں۔ اب عنقریب بندوبست فوج کا ہو جاتا ہے۔ ہم تھوڑی سی فوج معتبر لے کر عنقریب آئیں گے اور سید احمد خاں صدر امین اور رحمت خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر کو لکھا گیا ہے کہ تا پہنچنے ہمارے وہ انتظام وہاں کا اچھی طرح کریں گے، اور مسٹر پالٹر صاحب جنٹ میجسٹریٹ بجنور کا جو حال آپ نے دریافت کیا تھا، سو وہ مظفر نگر میں ہیں۔ میرٹھ میں

آئے تھے سو آج رات کو میران پور میں ہوں گے۔ بہ طلب خط بنام والی رام پور جو آپ نے لکھا تھا وہ ہم نے کل کی تاریخ انگریزی نواب رام پور کو لکھ بھیجا ہے اور ایک خط انگریزی مکرر آج بھی حسب درخواست آپ کو لکھ کر ان کے پاس بھیج دیں گے۔"

سقوط دہلی کے بعد ہر جگہ مجاہدین کا مورال متاثر ہوا۔ مارچ ۱۸۵۸ء میں فرنگیوں نے لکھنؤ پر قبضہ کرنے کے بعد اطمینان سے نجیب آباد کے خلاف اقدام کیا۔ انہوں نے اپنی افواج کا ایک بڑا حصّہ روہیل کھنڈ بھیجا۔ ۱۵ اپریل کو انہوں نے ہردوار پر قبضہ کر لیا اور نجیب آباد کی طرف پیش قدمی جاری رکھی۔ دریائے گنگا کو عبور کرکے ناگل کی طرف بڑھے جہاں جنگل میں مجاہدین کی پوزیشن مستحکم تھی۔ محکمہ نہر کے ایک سپرنٹنڈنٹ شیوا پرشاد نے فرنگیوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس علاقے کو نہر کے پانی سے بھر دیں۔ اس طرح بیسیوں مجاہدین پانی میں ڈوب گئے۔ جو بچ گئے، وہ بے جگری سے لڑے لیکن شکست اُن کا مقدر بن چکی تھی یہ حکمت عملی بتانے پر شیوا پرشاد کو ایک سو روپیہ انعام میں ملا۔ نواب صاحب کو قیدی بنا لیا گیا۔ ۱۹ اپریل کو نواب صاحب کے چھوٹے بھائی جلال الدین خاں اور سعد اللہ خاں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اگلے روز اُن کا کورٹ مارشل شروع ہوا اور ۲۳ اپریل کو انہیں نور پور میں گولی مار دی گئی۔ اُن کا دیوان خانہ بارود سے اُڑا دیا گیا۔ قاضی محلہ کے سب آدمی مارے گئے۔ دھام پور کی سڑک پر جس قدر بھی افراد ہاتھیوں پر سوار تھے، ہلاک کر دیئے گئے۔

فرنگیوں نے نواب صاحب سے، آپ کے وطن سے اور خاندان سے انتقام لینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ علاقے نذر آتش کر دیئے گئے۔ لیکن سرسید احمد خاں فرنگیوں کے اس اقدام کا جواز بھی اس طرح پیش کرتے ہیں!

"نہایت افسوس ہے کہ ہمارے حکام کو اس طرح شہر کا جلانا منظور نہ تھا، شاید اتفاقیہ آگ لگی اور بہ سبب اس کے کہ شہر خالی پڑا ہے

اور پانی بھی وہاں بہت کمیاب ہے، آگ کے بجھانے کا کچھ علاج
نہ ہوا۔ مگر عموماً یہ بات بہت مشہور ہوئی کہ ہندوؤں نے جن کے گھر
نواب نے جلا دیئے تھے اس فرصت کے وقت کو غنیمت سمجھ کر
قصداً تمام شہر میں آگ لگوادی اور جو رنج کہ ان کے دنوں میں تھا اس
کا بدلہ بخوبی لیا اور کچھ شک نہیں کہ ایسا ہی ہوا۔"
خود نواب صاحب کے لئے حبس دوام کی سزا تجویز ہوئی لیکن روانگی انڈمان
سے پیشتر آپ نے قید میں وفات پائی۔

نواب صاحب بذلہ سنج تھے۔ مہمان نوازی میں کوئی مقابلہ نہ کرسکتا تھا۔
بیشتر وقت شکار کھیلنے میں بسر کرتے تھے۔ فضول خرچی کی حد تک فیاض تھے۔
داد و دہش کے باعث ہمیشہ مقروض رہتے تھے یہاں تک کہ ۱۸۴۵ء میں اپنی
کثیر جائداد نواب محمد سعید خاں والئی رام پور کے پاس مرہون کردی۔ اپنے
مخالفین کو بھی برداشت کرتے تھے۔ سرسید احمد خاں آپ کو ہمیشہ ہی نا محمود خاں
کہتے لیکن آپ نے ثابت کردیا کہ آپ ان باتوں سے بالاتر تھے ؎

طمعِ فاتحہ از خلق نداریم نیاز!
عشق من از پس من فاتحہ خوانم باکیست



مولانا جعفر تھانیسری

آپ تھانیسر کے ضلع کرنال کے ایک ذی علم بزرگ تھے۔ ایک غریب گھرانے کے چشم و چراغ تھے لیکن اپنی قابلیت کی بُنیاد پر قصبے کے نمبردار ہو گئے۔ ایک روز ایک مجاہد مبلّغ کا وعظ سُنا تو اس کے بعد مسلمانوں میں سے بدعتوں کو ختم کرنے پر کمربستہ ہو گئے۔ آپ نے اپنے نفس کی مختلف کیفیات کا مطالعہ کرنے میں کافی وقت صرف کیا۔ پھر اپنے مذہبی تجربات کو "جعفر کے نصائح" کے زیرِ عنوان ۱۸ ذوالحجہ ۱۲۷۸ھ کو مرتب کرنا شروع کیا۔ اس میں صرف ایسے واقعات قلم بند کئے گئے ہیں جن کا تعلق دین و دُنیا سے ہے۔ اس میں آپ نے یہ ثابت کیا ہے کہ دُنیا فانی ہے۔ انسان چاہے کتنی طویل عمر ہی کیوں نہ پائے، سوائے افسوس اور ندامت کے وہ اپنے ساتھ کچھ نہ لے جائے گا۔

آپ بچپن میں ہی والد کے سایہ سے محروم ہو گئے۔ والدہ نے تعلیم دلوانے کا سلسلہ شروع کیا۔ وُہ خود بالکل ناخواندہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ بارہ برس سے پہلے آپ نے بھی تعلیم کی طرف توجہ نہ دی اور بے مقصد پھرتے رہے۔ پھر تعلیم میں ایسے منہمک ہوئے کہ ۱۸۵۶ء میں عرضی نویسوں کے زمرے میں داخل ہو گئے۔ اپنی محنت اور لگن سے ایسا نام پایا کہ وکلاء اور عرضی نویس آپ سے قواعد و ضوابط اور کونسل کے ایکٹ کے متعلق مشورے کرتے تھے۔ اردگرد کے بااثر زمینداروں نے آپ کو اپنا قانونی مشیر مقرر کر رکھا تھا۔ تمام لوگ آپ کے خلوص کے معترف تھے اور آپ کے پاس سے اثر قبول کئے بغیر نہ جاتے تھے۔

اتنی شہرت کے باوجود مولانا جعفر اپنے پیشے سے خوش نہ تھے۔ لکھتے ہیں

"اس پیشے میں مَیں نے اپنے مذہب کو بہت نقصان پہنچایا۔ ایسا پیشہ اختیار کرنا اچھا نہیں۔ اگر میں اس کو اختیار نہ کرتا تو میری مذہب میں حالت بہت اچھی ہوتی۔ جب مجھے عدالتوں سے فرصت ملتی خواہ دو دن کے لئے تو میری حالت بہت اچھی ہوجاتی۔ کافروں کے مسلمان ملازمین کے ساتھ محض تعلق ہی ہونا میرے پیشے کا ایک بڑا نقص تھا اور میرے نفس کے لئے ایک زہر قاتل کا حکم رکھتا تھا"۔[1]

تحریک آزادی کا آغاز ہوا تو دس جاں نثاروں اور وفاداروں کے ساتھ دہلی کو روانہ ہوئے۔ محاصرہ دہلی کے دوران میں خود مولانا نے اپنے ان ساتھیوں سمیت لڑائی میں حصہ لیا۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر ہنٹر لکھتا ہے۔

"جنگ کے غیر مانوس کام میں بھی ان کی اعلیٰ قابلیت نے ان کو نمایاں کردیا اور اب وہ ان لوگوں میں شمار ہونے لگے جن کے پاس باغیانہ راز محفوظ رہ سکتے ہیں"۔[2]

دہلی میں تحریکِ آزادی کی ناکامی کے بعد آپ واپس تھانیسر چلے گئے اور خدا تعالےٰ کی ان مصلحتوں پر غور کرنے لگے کہ کفار کو فتح کیوں ہوئی۔ اب آپ پہلے سے بھی زیادہ دل برداشتہ ہوچکے تھے لیکن آپ کے خفیہ فرائض نے آپ کے نفرت انگیز پیشہ کو مقدس بنا دیا کیونکہ آپ کا کہنا تھا کہ "میں نے اس کام کو ایک خاص آدمی[3] کے حکم کے مطابق اور ایک خفیہ مقصد کے لیے اختیار کر رکھا ہے"۔[4]

تحریک آزادی کی ناکامی کے بعد مولانا نے اصلاح و تبلیغ کا بیڑا اٹھایا اور اس

---

[1] بحوالہ ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۱۳۷ - ۱۳۸

[2] ایضاً ص ۱۳۸

[3] اشارہ پٹنہ کے مولانا یحییٰ علی کی طرف ہے۔

[4] بحوالہ ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۱۳۹

کے لئے ملک کے مختلف مقامات کے دورے شروع کئے۔ مگر فرنگی حکام برابر آپ کا پیچھا کرتے رہے۔ فرنگی سپرنٹنڈنٹ پولیس آپ کی گرفتاری کے وارنٹ لے کر تھانیسر آیا، جب آپ نہ ملے تو سینکڑوں گھروں کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ اس طرح بے شمار افراد پکڑے گئے۔ مولانا کی ضعیف والدہ اور برادر صغیر محمد سعید۔ جس کی عمر محض بارہ تیرہ برس تھی، پر تشدد کیا گیا۔ آپ کی اہلیہ کو گرفتار کرنے کے لئے ایک جماعت پانی پت گئی مگر مولانا رضی الاسلام کی والدہ کے حسن تدبیر سے وہ بچ گئیں آپ کا برادر صغیر تشدد برداشت نہ کر سکا اور بتا دیا کہ مولانا اس وقت دہلی میں ہیں فرنگیوں نے آپ کی گرفتاری کے لئے دس ہزار روپے کے انعام کا اشتہار بھی دے رکھا تھا۔

علی گڑھ میں آپ کو اس وقت گرفتار کیا گیا جب آپ نماز کی تیاری کر رہے تھے۔ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر دہلی لائے گئے اور پھانسی گھر میں بند کر دیئے گئے۔ اگلے روز پارسن، میجر نکفیل ڈی آئی جی پولیس اور ڈپٹی کمشنر ٹامی آپ کے پاس آئے اور آپ کے ساتھیوں کے نام پوچھے مولانا نے کچھ بتانے سے انکار کر دیا تو پارسن نے آپ پر تشدد کرنا شروع کیا جس کی وجہ سے آپ گر پڑے تو یہ لوگ چلے گئے۔ مولانا کے ذمہ رمضان کے کچھ روزے باقی تھے۔ آپ نے اگلے روز ان کی قضا رکھنی شروع کی۔

اگلے دن پارسن پھر آیا اور زدوکوب کرنے کے بعد انبالے کے ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر لے گیا جہاں ٹامی اور نکفیل بھی موجود تھے۔ ان تینوں نے بڑی خوشامد کی کہ دیگر مجاہدین کے نام بتا دو تو تم کو سرکاری گواہ بنا لیں گے، نیز عہدہ معزز بھی دیں گے بصورت دیگر پھانسی دی جائے گی۔ ساتھ ہی انہوں نے تحریری صورت میں عہد کرنے کو بھی کہا۔ جب آپ نے انکار کیا تو پارسن آپ کو دوسرے کمرے میں لے گیا اور بید زنی شروع کی۔ جس سے آپ کی کھال تک ادھڑ گئی اور منہ سے خون کے فوارے ابل پڑے۔ صبح آٹھ بجے سے رات کے آٹھ بجے تک بلا توقف بید زنی

جاری رہی پھر بھی آپ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اب آپ کو جیل میں بھیج دیا گیا۔ جیل میں جاکر آپ نے درخت کے پتوں سے روزہ افطار کیا۔

یہ تشدد صرف آپ کی ذات تک ہی محدود نہ رہا بلکہ پولیس نے آپ کے ایک گھریلو ملازم عباس کو مار مار کر ادھ موا کر دیا حتیٰ کہ اس کی موت واقع ہو گئی۔ اپریل میں آپ کا مقدمہ ضلع انبالہ کے سیشن جج کی عدالت میں پیش ہوا۔ آپ کے برادر صغیر محمد سعید کو پھانسی کی دھمکی دے کر سرکاری گواہ بنا دیا گیا۔ اس کے علاوہ پچاس ساٹھ کے لگ بھگ افراد، جن میں اکثریت مولویوں کی تھی، آپ کے خلاف گواہ بنائے گئے۔ اکثر گواہ شہادت دیتے وقت آپ کی طرف دیکھ کر زار زار روتے بھی جاتے تھے۔

۲ مئی ۱۸۶۴ء کو سر ہربرٹ ایڈورڈ نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا: "تم بہت عقلمند، ذی علم، قانون دان اور اپنے شہر کے رئیس اور نمبردار ہو۔ تمہاری سخت دشمنی، باغیانہ تگ و دو اور شرارت انگیز قابلیت میں مبالغہ کرنا ناممکن ہے۔ تم نے سوائے انکار بحث کے کچھ حیلتاً بھی خیر خواہی سرکار کا دم نہیں بھرا اور باوجود فہمائش کے اس کے ثابت کرانے میں کچھ کوشش نہ کی۔ اس واسطے تم کو پھانسی دی جائے گی اور تمہاری کل جائیداد ضبط بحق سرکار ہوگی اور تمہاری لاش بھی تمہارے ورثاء کو نہیں دی جائے گی۔ بلکہ نہایت ذلت کے ساتھ اس گورستانِ جیل میں گاڑ دی جائے گی۔"

سیشن جج نے آخیر میں یہ بھی کہا کہ "میں تم کو پھانسی پر لٹکتا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوں گا۔" موت کی سزا کا حکم سن کر مولانا کا چہرہ منور ہو گیا مگر اس آخری فقرے کے جواب میں کہا کہ "جان دینا اور لینا خدا کا کام ہے، تمہارے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ رب العزت قادر ہے کہ میرے مرنے سے پہلے تم کو ہلاک کر دے۔"

خدا تعالیٰ کی قدرت دیکھیں سیشن جج تھوڑے عرصے کے بعد ناگہانی موت سے جہنم واصل ہوا۔

جیل میں ایک رات محافظوں نے آپ کو فرار ہونے کا مشورہ دیا مگر آپ نے اُن کے مشورے کو مسترد کر دیا۔ فرنگی مرد اور عورتیں جیل میں آپ کو دیکھنے آتے اور ہشاش بشاش

دیکھ کر ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتے۔ ۱۹ ستمبر کو ڈپٹی کمشنر جیل میں آیا اور آپ کی سزا کو جس دوام میں بہ عبور دریائے شور میں بدل دیا اور کہا "ہم تمہیں اپنی مرضی کی موت نہیں مرنے دیں گے بلکہ تمہیں ایسی موت سے ماریں گے کہ تمہاری جان بڑے عذاب سے نکلے"۔ چنانچہ ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء کو مولانا انڈمان پہنچے۔ آپ کو مزید اذیت دینے کے لئے آپ کی داڑھی، مونچھ اور سر کے بال منڈوا دیئے گئے۔ آپ نے مسلسل اٹھارہ برس قید کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ۱۸۸۳ء میں لارڈ رپن کے حکم سے رہا کئے گئے، مگر آپ کی انگریز دشمنی کے جذبے میں کوئی فرق نہ آیا۔ غالباً ۱۹۰۵ء میں فوت ہوئے۔

مولانا درج ذیل کتب کے مصنف بھی ہیں۔

۱:۔ تاریخ عجیب — جزائر انڈمان کی تاریخ

۲:۔ تواریخ عجیب — معروف بہ کالا پانی۔ اس میں اپنی سرگزشت لکھی ہے۔

۳:۔ سوانح عجیب — اس میں سید احمد شہید اور ان کے اکابر خلفاء کے تفصیلی حالات مع متعدد مکتوبات درج کئے گئے ہیں۔



مولانا یحییٰ علی

مولانا یحییٰ علی پٹنہ کے رہنے والے تھے اور ایک ممتاز خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مالی اعتبار سے خوشحال تھے اور شروع میں فرنگیوں کے ساتھ نہایت خوشگوار مراسم بھی رکھتے تھے۔ مذہبی تعلیم پائی تھی، یہی وجہ ہے کہ مذہب کے ساتھ خاصا شغف تھا۔ پٹنہ کی ایک مسجد میں تبلیغ اسلام کے فرائض انجام دیتے تھے پٹنہ کا مرکزی دارالاشاعت اصلاحی جماعت خانہ کے نام سے مشہور تھا، یہ محلہ صادق پور کے بائیں طرف واقع تھا۔ اس کا حجرہ کافی بڑا اور گلی میں عقب کی طرف بھی کافی دُور چلا گیا تھا۔ اسی عمارت میں ایک چھوٹی سی مسجد بھی واقع تھی جہاں باجماعت نماز کے علاوہ جمعہ کی نماز بھی ادا کی جاتی۔

مولانا یحییٰ علی رئیس المبلغین تھے۔ آپ کا کام مرکزی دارالاشاعت کو چلانا تھا جہاں جنوبی بنگال کے مختلف اضلاع سے مبلّغین آتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سیّد احمد شہید کے پیروکاروں کو سرحد کے علاقے میں اعانت درکار تھی۔ اس اعانت کی فراہمی مولانا یحییٰ علی ہی کے سپرد تھی جو اصلاحی جماعت خانہ میں آنے والے بھائیوں کا بڑے جوش سے خیر مقدم کرتے۔ رنگروٹوں کے سامنے آپ جمعہ کے خطبہ میں جہاد کی فضیلت پر زور دینے کے علاوہ آپ انہیں الہیات کا درس بھی دیتے اُن پر یہ بات واضح کر دی جاتی کہ عقیدہ کے بغیر ہر فعل عبث ہے۔ سامعین کو روحانی خطرے سے آگاہ کرتے اور انہیں روحانی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیتے۔ برصغیر کے تمام سفری مبلّغین کا روحانی پیشوا ہونے کی حیثیت سے ان کے ساتھ خط وکتابت کرتے پھر جُملہ دستاویزات کو خفیہ زبان میں ترتیب

دیتے اور رقم کرتے۔ اس طرح بھاری رقوم سرحد کے پار کے مجاہدین تک پہنچ جاتیں۔ بندوقوں کی جانچ پڑتال بھی آپ ہی کے ذمہ تھی۔ دارالاشاعت کو وہ اپنی خفیہ زبان میں چھوٹا مال گودام اور مجاہدین کے سرحدی کیمپ کو بڑا مال گودام کہتے تھے[1] پٹنہ سے سرحد تک تمام راستے پر جماعت خانوں کا قیام بھی آپ ہی کے ذہن رسا کی پیداوار تھا۔ ان کا انتظام معتبر مریدوں کے ذمہ تھا اور ایک مقامی باشندہ ان کا صدر ہوتا تھا۔ یہ افراد اتنے وفادار ہوتے تھے کہ ان میں سے کسی ایک نے بھی گرفتار ہونے کے خوف یا لالچ کی ترغیب سے اپنے امام کے خلاف گواہی دینے پر آمادگی ظاہر نہ کی۔

مولانا یحییٰ علی پر یہ جرم بھی عائد کیا گیا کہ وہ سرحد پار کے "باغیوں" کے لئے ترسیل زر اور فراہمی مجاہدین کے اصل مہتمم تھے۔ حوالات میں آپ پر ناقابل بیان صعوبتوں کے پہاڑ ڈھائے گئے۔ آپ نے عدالت میں پیشی کے وقت ترک سوالات کر رکھی تھی اور ہر وقت یاد الٰہی میں گزارتے۔ پیشی کے پہلے روز بار بار اصرار پر بھی نماز ظہر کی اجازت جو نہ ملی تو آپ نے اپنے تمام گرفتار شدہ ساتھیوں کے ساتھ ہی عدالت میں سنگینوں کے پہرہ میں تکبیر کہہ کر نماز باجماعت ادا کی۔ جب دو روز یہی ہوتا رہا تو عدالت نے ایک ایک قیدی کو باہر سے جا کر نماز پڑھنے کی اجازت دے دی۔ زمانۂ حوالات میں تین ماہ تک کال کوٹھریوں میں رکھے گئے۔ آپ ہر وقت ذکر و شغل میں منہمک شاداں اور فرحاں رہتے تھے اور تبلیغ کا فیض جاری رکھتے۔ سپاہی عام طور پر سکھ یا گورکھے ہوتے، آپ اُن کو ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ کا وعظ سناتے۔ سپاہی پہرہ بدلنے کے وقت بھی جانا پسند نہ کرتے۔ کتنے ہی سپاہیوں نے دامنِ توحید میں پناہ لی۔

سر ہربرٹ ایڈورڈ نے مولانا یحییٰ علی کو سزائے موت تجویز کرتے ہوئے کہا:

---

[1] ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۱۴۰

"یہ امر پایۂ ثبوت تک پہنچ گیا ہے کہ یحییٰ علی ہی اس سازش کا کرتا دھرتا ہے جس کا انکشاف اس مقدمہ میں ہوا۔ وہ بہت تعلیم یافتہ انسان ہے اور اپنی لاعلمی کا عذر پیش نہیں کر سکتا۔ جو کچھ اس نے کیا سوچ سمجھ کر عمداً اور سخت باغیانہ طریقہ پر کیا۔ وہ موروثی باغی ہے اور ایک متعصب خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی خواہش ایک مذہبی مصلح کے درجہ تک پہنچنے کی ہے۔ لیکن بنگال کے برہمو سماجی ہم وطنوں کی طرح دلیل اور فطرتِ صالح سے اپیل کی بجائے وہ اپنا مقصد سیاسی انقلاب سے پورا کرنا چاہتا ہے اور دیوانوں کی طرح اس حکومت کے خلاف سازش کرتا ہے جس نے ہندوستانی مسلمانوں کو تباہی سے بچایا اور یقینی طور پر مذہبی آزادی عطا کی۔"

مولانا یحییٰ علی کو مولانا جعفر تھانیسری اور ٹھیکیدار محمد شفیع کے ساتھ ہی سزائے موت سنائی گئی۔ اس وقت آپ نہایت ہشاش بشاش تھے۔ لعدمیں یہ سزا دائم الحبس لعبور دریائے شور میں تبدیل کر دی گئی۔ جیل میں مقراض سے آپ کی داڑھی مونچھ اور سر کے بال تراش دیئے گئے۔ آپ اپنی داڑھی کے کترے ہوئے بالوں کو اٹھا اٹھا کر کہتے تھے کہ افسوس نہ کر تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اس کے واسطے پکڑی گئی۔ آپ کو رہٹ چلانے کی مشقت پر لگایا گیا۔ آپ دھوپ کی تپش میں اس کو چلاتے حتیٰ کہ پیشاب میں خون آنے لگا۔ صحت مند قیدی تھک کر بیٹھ جاتے مگر آپ صبح سے شام تک اپنی مشقت میں لگے رہتے تا آں کہ ڈاکٹر نے ان کی حالت پر ترس کھایا اور انہیں دری بافی کے کام میں لگایا۔ کھانے کو محض دو روٹیاں ملتیں اور اکثر قیدی جیل کی گھاس اور جڑیں اکھاڑ کر پیٹ بھرتے لیکن مولانا سب کو نصیحت کرتے کہ جب تک تم سرکاری کھانا کھاتے ہو اور سرکار کا کپڑا پہنتے ہو اور اس کے مکان میں رہتے ہو تو ضروری ہے کہ سرکاری کام کو انجام دو۔[1]

---

[1] مسلمانوں کا شاندار مستقبل ص ۱۳۱

حکومت نے مولانا یحییٰ علی کو یہ سزا دینے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ اس خاندان کے عالیشان مکانات مسمار کر دیئے گئے کیونکہ پٹنہ کے لوگ یہ جائداد خریدنے پر تیار نہ ہوئے۔ اس بربریت کا مظاہرہ عین عید کے روز کیا گیا (۱۸۶۵ء) ؎

مایۂ عیش سازِ ماتم شد
عید ما غرۂ محرّم شد

مکینوں کو ایک سوئی تک نہ لے جانے دی ؎

بہر ما بود آہ جرمے سخت
بردن سوزنے زجملہ رخت

مکانات اور باغات کے علاوہ خاندانی قبرستان بھی کھود ڈالا گیا اور اس وسیع قطعہ زمین پر بازار اور بلدیہ کی عمارت تعمیر ہوئی۔ جب یہ اطلاع مولانا یحییٰ علی کو ملی تو صبر و شکر کے اس پیکر نے اپنی اہلیہ کو محبت بھرے تسلی کے خط میں لکھا: "اللہ تعالیٰ کا بہت شکر کرو کہ تم ایسے امتحان کے لائق ٹھہرے" [۱]

---

[۱] موج کوثر ص ۵۵۔

مولانا پیر علی

مولانا پیر علی لکھنؤ کے رہنے والے تھے لیکن مجاہدانہ سرگرمیوں کے سلسلہ میں پٹنہ اُٹھ آئے تھے اور وہاں کُتب فروشی کا پیشہ اختیار کیا۔ مولانا غلام رسُول مہر کا خیال ہے کہ تجارت مقصود نہ تھی۔ اُن کی اصل غرض یہ تھی کہ اہل وطن کو انگریزوں کے خلاف معرکہ آرائی کے لئے تیار کریں۔ غالباً وُہ کسی خُفیہ جماعت کے بہت بڑے رُکن تھے جس کے حالات اب تک نہ معلوم ہو سکے اور جماعت ہی نے انہیں کارخاص کے لئے پٹنہ بھیج دیا تھا۔[1] اُس وقت بہار صُوبہ بنگال میں شامل تھا۔ ولیم ٹیلر یہاں کا کمشنر تھا، جب اُسے یہ خبر ملی کہ تحریک آزادی کے مجاہدین پٹنہ سے محض دس میل کے فاصلہ پر دانا پور میں ٹھہرے ہُوئے ہیں تو اُس نے تمام یورپی افراد کو اپنے مکان میں پناہ دی اور شہر کے سات سرکردہ عُلماء کو ایک اجلاس میں تبادلۂ خیالات کے لئے بُلایا لیکن ان میں سے تین کو حراست میں لے لیا۔ ان کی گرفتاری سے شہر میں بے چینی پھیلی تو اُس نے اہل شہر کو حکم دیا کہ وُہ اپنے ہتھیار قریبی پولیس اسٹیشن میں جمع کرائیں۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے اُن تمام افراد کو بھی گرفتار کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا جن پر اُسے سرکار مخالف ہونے کا شبہ تھا۔ ان میں وارث علی اور علی کریم نامی مجاہدین شامل تھے لیکن موخرالذکر حراست میں لینے والے میجسٹریٹ کو طرح دے گئے۔

پٹنہ میں ۳ جولائی کو تحریک آزادی کا بگل بجایا گیا، اس کا سہرا مولانا پیر علی کے

---

[1] مقالہ، مولانا پیر علی، ہفت روزہ چٹان، لاہور، ۳ جنوری ۱۹۵۷ء

سر ہے۔ آپ نے دو سو مجاہدین کے ساتھ سبز پھریرا لہرایا اور نقارہ بجاتے ہوئے اعلان کیا کہ مسلمانو! اللہ کے دین کی خاطر تحریک میں شامل ہو جاؤ۔ پہلا دھاوا رومن کیتھولک چرچ پر کیا گیا۔ ڈاکٹر لائل جو اسلام پر طعن زنی کیا کرتا تھا، مولانا نے اُسے ہلاک کیا۔

۴ جولائی کو ایک سکھ رجمنٹ ریٹرے کی قیادت میں آ پہنچی۔ سکھوں نے شدید آتش باری کی۔ مجاہدین ان سے نہتے کیا لڑتے اکتیس افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان میں مولانا پیر علی بھی شامل تھے۔ پٹنہ کے مشہور سیٹھ لطف علی خاں بھی ساتھ تھے جو مجاہدین کی مالی معاونت کر رہے تھے، انہیں بھی دھر لیا گیا۔ البتہ ان کی دولت نے انہیں بچا لیا۔ اُن کے گماشتہ شیخ گھیٹا بھی گرفتار ہوئے۔ ان میں سے پندرہ افراد کو فوراً پھانسی دے دی گئی۔ دوسرے یا تیسرے روز مولانا پیر علی کو بھی پھانسی دے دی گئی۔ پھانسی دینے سے قبل اُن کو معافی کی پیش کش کی گئی۔ بشرطیکہ وہ مکمل سازش کو طشت از بام کریں۔ آپ نے جواب دیا۔

"زندگی میں بعض مواقع زندگی بچانے کے آتے ہیں اور بعض قربانی کے یہ موقع میری قربانی کا ہے"[۱]

ساور کر رقم طراز ہے: "ان پیغمبرانہ الفاظ کے بعد وہ سچا محب وطن، بغیر اس کے کہ اپنے ملک کے چہرے پر غداری کا داغ ڈالے، موت کے دروازے سے ہوتا ہوا شہیدوں کے اُس گروہ سے جا ملا جو غیر فانی یاد میں رہتے ہیں"
مولانا غلام رسول مہر آپ کی گرفتاری کے بعد انگریز افسر سے ہونے والی گفتگو یوں بیان کرتے ہیں:[۲]

ULEMA IN POLITICS, P.374

[۲] مقالہ: مولانا پیر علی، ہفت روزہ چٹان، لاہور، ۳ جنوری ۱۹۵۶ء

۱۱۔ میری دوکان کے متعلق تمہارا فیصلہ کیا ہے؟
انگریز افسر نے جواب دیا کہ وہ ضبط کر لی جائے گی

۱۲۔ میری جائداد کے بارے میں کیا حکم صادر کر رہے ہو؟
وہ ضبط کر لی جائے گی

۱۳۔ میرے بال بچوں کے بارے میں تم نے کیا تجویز کیا ہے؟
اُن کے متعلق فی الحال کچھ نہیں کیا جا سکتا، نہ وعدہ کیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد آپ سکون کے ساتھ پھانسی کے مقام کی طرف چل دیئے۔ آپ کے چہرے پر کسی قسم کی گھبراہٹ کے آثار نہ تھے۔ کسی طرح بھی یہ ہویدا نہ تھا کہ آپ کی رُوح کسی طور پر بھی پریشان ہے۔



مولانا لیاقت علی

مولانا لیاقت علی مہا گاؤں میں پیدا ہوئے جو ضلع الہ آباد میں چٹیل کے پرگنہ کا ایک دیہات ہے۔ حسب ونسب کے اعتبار سے سیّد تھے نہ کہ جولا ہے جیسا کہ بعض انگریز مصنفین نے لکھا ہے۔ آپ کے والد مہر علی ایک کسان تھے۔ مولانا لیاقت علی نے مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کے ایک شاگرد سے تعلیم حاصل کی تھی۔ آپ پر سیّد احمد شہید کے خیالات اور عقائد کی گہری چھاپ لگی ہوئی تھی۔ مذہب کا رنگ بھی آپ پر غالب تھا۔ اپنے تقویٰ کے ناطے پورے علاقے میں محترم جانے جاتے تھے۔ شروع میں کچھ عرصہ فوج میں بھی ملازمت کی پھر مستعفی ہوگئے اور اپنا تمام تر وقت تبلیغ میں صرف کرنے لگے۔ کچھ عرصہ مدرّس بھی رہے۔

اپنی انگریز دشمنی کے سبب مشہور تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ تحریکِ آزادی کے قائدین مولانا احمد اللہ شاہ، عظیم اللہ خاں اور بخت خاں کے شرکت کردہ اجلاس میں بھی شامل ہوئے تھے۔ اس اجلاس میں آپ کے ذمہ یہ فرض سونپا گیا کہ مختلف مراکز میں انقلابیوں کو جہاد کے آغاز کی تاریخ یعنی ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کی اطلاع دیں۔ اس پر آپ نے بڑی جانفشانی کے ساتھ مختلف علاقوں کا دورہ کیا[1]

الہ آباد گنگا اور جمنا کے سنگم پر واقع ہے۔ حربی نقطۂ نگاہ سے دوآب میں اس کی بڑی اہمیت تھی۔ یہاں ایک مضبوط قلعہ تھا جس میں کثرت سے سامانِ

---

[1] عبدالباری عاصی، الجمعیت ۱۷۔اگست ۱۹۵۷ بحوالہ

ULEMA IN POLITICS, ص ۲۰۷

جنگ بھرا ہوا تھا۔ بڑی ریلوے لائن اور جی ٹی روڈ پر واقع ہونے کی وجہ سے وسطی ہندوستان اور اِدھر اُدھر تک یہاں سے آسانی کے ساتھ رسائی ہو سکتی تھی۔

۴ جون تک یہاں کے سپاہیوں نے ذہنی طور پر تحریکِ آزادی میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ۶ جون کو اُس وقت جہاد شروع ہوا جب فرنگی افسر کھانے کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ کچھ مارے گئے اور باقیوں نے بھاگ کر قلعے پناہ لی۔ شہر میں بھی جہاد شروع ہو چکا تھا۔ مجاہدین نے مولانا کو اتفاق رائے سے اپنا امیر چُنا اور الہ آباد کے نظم و نسق کی درستی کا کام سنبھال لیا۔ بعد میں بہادر شاہ ظفر نے آپ کو الہ آباد کا گورنر مقرر کیا۔ مولانا نے خسرو باغ میں اپنے ہیڈ کوارٹرز قائم کئے۔ آپ نے مسلمانوں سے جہاد کی اپیل کی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد رکھنے اور قلعے کو مسخر کرنے کے لئے اقدامات کرنے شروع کر دیئے۔

اُس وقت قلعے میں ایک سکھ رجمنٹ تعینات تھی۔ مولانا کی قیادت میں قلعے پر بار بار حملہ کیا گیا لیکن ہر بار توپ خانہ نہ ہونے کی وجہ سے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ ۱۱ جون کو نیل بنارس سے کمک کے ساتھ الہ آباد پہنچ گیا۔ اُس نے ۱۲ جون کو دریا گنج پر گولہ باری کی، اس کا ایک حصہ جل کر خاکستر ہو گیا۔ مولانا نے مقابلے کی بہت کوشش کی لیکن لوگوں میں استقلال اور عزم کا فقدان تھا۔ ان کی حیثیت دراصل منظم لشکر کی نہ تھی بلکہ محض ایک بھیڑ کی تھی جو عموماً چلنے کی جگہ بہتی اور رُکنے کی جگہ گر جاتی ہے[1] لوگ انگریزوں کی آمد کی خبر سُن کر ہی شہر چھوڑ کر بھاگنا شروع ہو گئے۔ میلی سن نے مولانا کی ایک تحریر درج کی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ قلعے سے شہر پر شدید گولہ باری کی افواہ پھیل گئی تھی، اس وجہ سے لوگ بھاگ گئے۔ نہ کسی گھر میں کوئی متنفس رہا، نہ شہر میں کوئی چراغ نظر آتا تھا[2] اب فرنگیوں نے

۱؎ ۱۸۵۷ء، مولانا غلام رسول مہر ص ۳۲۰

۲؎ میلی سن ج دوم ص ۲۰۱ بحوالہ ۱۸۵۷ء مولانا غلام رسول مہر ص ۳۲۰

شہریوں کو بے دریغ قتل کرنا شروع کیا۔ ہر اُس شہری کو تہ تیغ کر دیا گیا جو بھی اُن کے ہتھے چڑھا۔ محض الہ آباد میں سات ہزار افراد کو پھانسی دی گئی۔[1] نیل اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے کہ، ا جُون کو عیسٰے علی نام کا ایک سوار اس جُرم میں اس کے سامنے پیش ہُوا کہ اس نے "بغاوت" میں حصّہ لیا تھا۔ نیل نے اُسے فوراً پھانسی دیئے جانے کا حکم دیا حالانکہ وہ بیس برس انگریزوں کے پاس ملازم رہ چکا تھا۔ نیل رقمطراز ہے۔ "میں نے سب کچھ اپنے مُلک کی بھلائی کے لئے کیا، اِس لئے کہ میرے مُلک کا اقتدار و وقار بحال ہو جائے اور یہ حد درجہ وحشیانہ اور غیرانسانی بغاوت فرد ہو جائے۔"[2]

مولانا بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور کان پور چلے گئے۔ فتح پور کی لڑائی میں بھی شرکت کی۔ جب مولانا احمداللہ شاہ نے محمدی میں عارضی حکومت قائم کی تو مولانا لیاقت علی اس کے ایک رُکن تھے۔ بعد میں نیپال چلے گئے جہاں سے گرفتار ہُوئے۔ ۱۸۷۲ء میں مقدمہ چلا جس میں انہوں نے اقرار کیا کہ انہوں نے جہاد میں فعّال کردار ادا کیا تھا۔ آخرکار کالے پانی کی سزا ملی۔

---

[1] قیصر التواریخ ج دوم ص ۲۵۰ - ۲۵۱

[2] میلی سن ج دوم ص ۲۰۲ حاشیہ بحوالہ ۱۸۵۷ء مولانا غلام رسُول مہر ص ۳۲۲

نواب ولی داد خان

آپ مالاگڑھ سے تعلق رکھتے تھے جو بلند شہر سے تقریباً چار میل کے فاصلے پر واقع ایک قصبہ تھا۔ آپ کے والد نواب بہادر خان مالاگڑھ کے تعلقہ دار تھے۔ اُن کی وفات پر فرنگی حکام نے مالاگڑھ سے ملحقہ پرگنہ اگوٹا کے چھتیس دیہات ہتھیا لینے کے ساتھ ساتھ مالاگڑھ جاگیر کی حدود بھی کم کر دیں۔ صرف بیس دیہات ولی داد خان کے لئے مختص کئے اور چوبیس دوسرے دیہاتوں میں آپ کی شراکت رکھ دی۔ محض ایک ہزار روپے آپ کا وظیفہ مقرر ہوا۔ یہ ۱۸۲۴ء کا واقعہ ہے۔ اُس وقت آپ نا بالغ تھے۔ جب آپ سنِ شعور کو پہنچے تو آپ نے دہلی کے ریذیڈنٹ کے پاس اپیل کی، پھر اپنا معاملہ گورنر جنرل تک پہنچایا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

جب تحریک آزادی شروع ہوئی تو ۱۳ مئی کو بہادر شاہ ظفر نے آپ کو دربار میں طلب کر کے حکم دیا کہ وہ فوراً جمنا پار کے علاقے کا نظم و نسق سنبھالیں اور گوجروں کی سرکوبی کریں جنہوں نے اُس علاقے میں لوٹ مار مچا رکھی تھی۔ گوجر دریائے جمنا کے کنارے ضلع بلند شہر بلا دادری، دنکور اور سکندر آباد کے پرگنوں میں بکثرت آباد تھے۔ میرٹھ میں علمِ جہاد بلند ہونے کے ساتھ ہی انہوں نے ۱۲ مئی کو سکندر آباد کے نواح میں قتل و غارت شروع کر دی، ٹیلیگراف تار کاٹ دیئے اور ریسٹ ہاؤس کو آگ لگا دی۔ فرنگیوں کی دیسی فوج کی ایک رجمنٹ سکندر آباد کے گوجروں سے اُلجھی۔ لیکن پھر بھی بہت سے گوجر گرفتار کر لئے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد گوجروں نے امراؤ سنگھ کی سرکردگی میں بلند شہر پر حملہ کر دیا۔ فرنگی بھاگ گئے اور گوجر چار روز تک شہر کو لوٹتے رہے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ نواب ولی داد خاں کی ایک بھانجی شہزادہ جواں بخت کے عقد میں تھی۔ ۱۷ مئی کو نواب صاحب نے بہادر شاہ ظفر سے اپنی مکمل جاگیر کی واگزاری کی استدعا کی اور باقاعدگی سے لگان بھیجنے کا وعدہ کیا۔ شاہ نے آپ کی مکمل جاگیر بحال کرنے کے ساتھ وعدہ کیا کہ ضرورت پڑنے پر مرکزی حکومت آپ کو سامانِ حرب اور مالی امداد بھی دے گی۔

۲۶ مئی کو فرنگیوں نے گورکھا بٹالین کی مدد سے بلند شہر پر دوبارہ قبضہ کیا۔ اس دوران میں تحریک آزادی زور پکڑ رہی تھی۔ کئی جاگیردار تذبذب میں تھے کہ وہ کیا طرزِ عمل اختیار کریں۔ کیچھر کے راجہ راؤ گلاب سنگھ، جاگیردار چھتاری محمود علیخاں جاگیردار پہاسو مراد علی خاں، جاگیردار شکار پور لچھمن سنگھ اور جاگیردار خان پور نواب عبداللطیف خان نے بلند شہر کے فرنگی حاکم سپیٹ سے عملی وفاداری کا ثبوت دیا۔ چونکہ نواب ولی داد کا طرزِ عمل واضح نہ تھا اس لئے سپیٹ نے انہیں آزمانے کے لئے گوجروں کی سرکوبی کا حکم دیا جب کہ ۲۹ مئی کو انہوں نے سکندر آباد پر حملہ کیا تھا۔ نواب ولی داد نے کوئی اقدام نہ کیا تو سپیٹ خود ایک رجمنٹ کے ہمراہ مالاگڑھ کی طرف بڑھا۔

دریں اثنا حالات تبدیل ہو چکے تھے۔ ۱۰ جون کو فرنگی فوج میں بے قاعدہ دیسی گھوڑ سواروں نے بغاوت کردی۔ سپیٹ اپنے حامیوں سمیت گلھاٹھی کی طرف چلا گیا جو بارہ میل کے فاصلے پر ایک قصبہ تھا۔ جب اُس نے مجاہدین کی دہلی کی طرف روانگی کا سُنا تو وہ بلند شہر کی طرف واپس آیا لیکن اب شہر پر نواب ولی داد خان کا قبضہ تھا جہاں محمد اسمٰعیل خان کی سرکردگی میں فوج نے جہاد شروع کر دیا تھا۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے والی بات۔ سپیٹ نے بلند شہر پر دھاوا بول دیا لیکن اُسے ۱۱ جون کو منہ کی کھانی پڑی۔

نواب ولی داد کی یہ کامیابی مجاہدین کے جذبے کی وجہ سے تھی ورنہ آپ کی فوج میں باقاعدہ سپاہیوں کی قلت تھی۔ گوجروں کی حیثیت ایک انبوہ سے

بڑھ کر نہ تھی۔ نواب ولی داد کی یہ پوزیشن اڑوس پڑوس کے جاگیر داروں کو ایک نظر نہ بھائی۔ ان میں عبداللطیف خان کے علاوہ چھتاری، پہاسو، دھرم پور اور دان کے تعلقہ دار تھے۔ عبداللطیف خان اپنے سے چھوٹے تعلقہ دار ولی داد خان کی بڑھتی ہوئی قوت سے خائف تھا۔ اس نے بیک وقت فرنگیوں اور بہادر شاہ ظفر سے خط و کتابت جاری رکھی لیکن جب بعد میں فرنگیوں نے بلند شہر پر قبضہ کیا تو اس نے علاقے کا لگان جمع کر کے فرنگیوں کو بھیجا۔ فرنگیوں نے اُسے اس پر بھی مُلک بدر کر کے اُس کی تمام جاگیر ضبط کر لی۔ لیکن ایسے بھی تعلقہ دار تھے جنہوں نے نواب موصوف سے تعاون کیا۔ ان میں خیلیہ کے مظہر علی خاں، اُن کا فرزند رحیم خاں، کرم حسین، طالب حسین، مسعود علیخاں اور شہرت علی قابل ذکر ہیں۔ انہوں گوجر سردار چوہدری لچھمن سنگھ کے چند دیہات بادشاہ کے نام پر اپنے قبضے میں لے لئے۔ گھرجا میں مُراد علی خاں نے نواب ولی داد کی حمایت میں سبز پرچم لہرایا۔ نواب صاحب اعظم خاں کو وہاں تحصیلدار مقرر کیا جسے بعد میں فرنگیوں نے پھانسی کی سزا دی۔

فرنگی فوج کو علی گڑھ میں شکست ہوئی تو ۲ جولائی ۱۸۵۷ء کو شہر کے ایک وکیل بسم اللہ نے نواب ولی داد سے رابطہ قائم کیا کہ وہ اپنے دائرہ اختیارات کو علی گڑھ تک بڑھائیں لیکن آپ کے وسائل نے اس بات کی اجازت نہ دی۔ دوسرے پڑوسی تعلقہ داروں کا رویہ بھی موافق نہ تھا۔ اس کے باوجود نواب ولی داد میں حوصلہ اور عزم بدرجہ اتم موجود تھے۔ انہوں نے بلند شہر پر قبضے کے بعد خزانے کا ایک معقول حصہ دہلی بھیجا اور درخواست کی کہ وہ جاٹوں اور فرنگیوں کا مقابلہ کر کے میرٹھ کی طرف پیشقدمی کرنا چاہتے ہیں لہٰذا فوج اور ضروری سامان حرب مہیا کیا جائے۔ افسوس خود دہلی کے حالات سازگار نہ تھے، اس لئے نواب صاحب کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اور آپ کی طاقت مالاگڑھ تک ہی محدود رہی۔

۲۹ جولائی کو فرنگی فوج نے گلھاٹھی کے مقام پر نواب ولی داد خاں پر حملہ کیا۔ اسوقت آپ کو گوجر سردار امین سنگھ کی حمایت بھی حاصل تھی۔ اس طرح آپ کے ہمراہ

چار سو سوار، چھ سو پیدل اور ایک ہزار گوجر اور راجپوت تھے۔ فرنگیوں کو شکست ہوئی۔
دہلی کی تسخیر کے بعد فرنگیوں نے افواج کو بلند شہر کی طرف روانہ کیا۔ نواب ولی داد کو پسپا ہونا پڑا۔ اس طرح آپ بریلی چلے گئے جہاں خان بہادر خاں نے آپ کو چار رجمنٹیں پیادہ۔ ایک ہزار سوار اور دو توپیں دیں تاکہ آپ دوبارہ مالاگڑھ پر قبضہ کریں۔ لیکن اب پانسہ پلٹ چکا تھا اور فرنگی برابر بڑھتے چلے آ رہے تھے مئی ۱۸۵۸ء میں نواب موصوف نانا راؤ کے پاس چلے گئے۔ فرنگی آپ کو زندہ گرفتار کرنا چاہتے تھے جاسوس اور مخبر آپ کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ دسمبر ۱۸۵۸ء میں انہیں خبر ملی کہ نواب صاحب شہزادہ فیروز شاہ کے لشکر میں شامل ہیں لیکن وہ آپ کو گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ فرنگیوں نے اپنا تمام غصہ مالاگڑھ کے لوگوں پر نکالا اور یہاں کے قلعہ کو یکم اکتوبر ۱۸۵۸ء کو بارود لگا کر مسمار کر دیا۔



مولانا کفایت علی کافیؔ

آپ کا تعلق مُرادآباد کے ایک سادات خاندان سے تھا۔ مُرادآباد میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بریلی اور بدایوں میں بھی تحصیل علم کے سلسلے میں رہے۔ شاہ ابوسعید مجددی سے علم حدیث پڑھا۔ مولانا کافیؔ کو تمام علوم عقلیہ و نقلیہ کے علاوہ علمِ طب، حرف و نحو اور شاعری و ادب میں بھی کمال حاصل تھا۔ شرح شمائل ترمذی کے ترجمے کے مصنف بھی تھے۔ شاعر بھی تھے اور کافیؔ تخلص کرتے تھے۔ مولوی عبدالغفور نساخ لکھتے ہیں:"صاحبِ علم و فضل و زہد و تقویٰ ہیں۔ بیشتر اشعار ان کی حمد و نعت میں ہوتے ہیں"[۱]

میرٹھ میں تحریک آزادی کے آغاز کی خبریں مُرادآباد میں ۱۱ مئی، ۱۸۵۷ء کو پہنچیں۔ جب یہاں بھی لوگوں کے جذبات برانگیختہ ہوئے تو ضلع کا انتظام کرافسٹ وِلسن کے حوالے کیا گیا جو سترہ برس سے یہاں بطور جج تعینات تھا اور یہ خیال کیا گیا کہ وہ وہاں کے حالات اور لوگوں کے مزاج سے خوب واقف تھا۔ لیکن لوگوں کے جوش و خروش میں کوئی فرق نہ پڑا حتیٰ کہ ۱۹ مئی کو جیل توڑ کر قیدیوں کو چھڑا لیا گیا۔ آزاد حکومت میں مولانا صدرالشریعت مقرر ہوئے جمعہ کو مسجد میں جہاد ہی موضوعِ سخن ہوتا۔ ڈسٹرکٹ گزٹیئر مرادآباد میں لکھا ہے:

"مسلمانوں نے من حیث القوم ضلع بھر میں برٹش گورنمنٹ سے اپنی مخالفت کو نہایت صاف اور صریح طریق پر ظاہر کیا۔ روہیل کھنڈ کے

---

[۱] سخن شعراء ص ۳۹۵

اضلاع کی طرح مُرادآباد کے ضلع میں بھی تعصب مذہبی اور انگریزوں کی ہربات سے انتہائی تنفّر کے جذبات نے مسلمانوں کو عام بغاوت پر مشتعل کیا تھا۔"

مُرادآباد اور بریلی میں تحریک کے عرُوج کے دِنوں میں فرنگیوں نے نینی تال میں پناہ لی۔ یہاں یہ ذکر بر محل ہے کہ نواب یُوسف علی والئی رام پور فرنگیوں کا حلیف تھا۔ جب مراد آباد میں مجاہدین کی آزاد حکومت قائم ہوئی تو اُس نے پیش قدمی کر کے مراد آباد پر قبضہ کر لیا۔ اب مولانا کافی نے فرنگیوں کے خلاف ایک فتوٰی جہاد جاری کیا جس کی نقول دُوسرے مقامات پر بھی بھجوائیں۔ اس فتوٰی کو مؤثر بنانے کے لئے آپ نے کئی علاقوں کا دورہ بھی کیا۔

۲۵ اپریل ۱۸۵۸ء کو جنرل جونز مُرادآباد آیا تو والئی رام پور کے فرستادوں نے وہاں کا انتظام اس کے سپرد کر دیا۔ اب جور و ستم کا سلسلہ شروع ہوا۔ فخرالدین کلال نامی ایک شخص کی مخبری پر مولانا کفایت علی کافی گرفتار ہوئے۔ مختلف الزامات کی روشنی میں معمولی کاروائی کے بعد پھانسی کا حکم ہوا۔ اس پر مولانا نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ ۳۰ اپریل ۱۸۵۸ء کو تختۂ دار کی طرف بلند آواز سے اپنی ایک تازہ غزل پڑھتے ہوئے بڑھے، جو کہ درج ذیل ہے۔

کوئی گُل باقی رہے گا نے چمن رہ جائے گا
پھر رسُول اللہ کا دینِ حسَن رہ جائے گا

ہم صفیرو باغ میں ہے کوئی دم کا چہچہا
بُلبلیں اُڑ جائیں گی سُونا چمن رہ جائے گا

اطلس و کمخواب کی پوشاک پر نازاں نہ ہو
اس تنِ بے جان پر خاکی کفن رہ جائے گا

نامِ شاہانِ جہاں مٹ جائیں گے لیکن یہاں
حشر تک نام و نشانِ پنجتن رہ جائے گا

جو پڑھے گا صاحبِ لولاک کے اُوپر درُود
آگ سے محفوظ اس کا تن بدن رہ جائیگا

سب فنا ہو جائیں گے کافی و لیکن حشر تک
نعت حضرت کا زبانوں پر سخن رہ جائیگا

مولانا محمد عمر نعیمی مرادآبادی کا بیان ہے کہ مولانا آفی کی قبر شہادت کے کوئی ۲۵ برس بعد سڑک میں آگئی جس سے قبر کھل گئی۔ آپ کا جسم ویسا ہی تھا جیسا رکھا تھا۔ مولانا عمر نعیمی کے نانا شیخ کرامت علی، جو متعلقہ ٹھیکیدار تھے، نے جسم مبارک کو دوسری جگہ دفن کرا دیا۔[1]

---

[1] العلم جنگِ آزادی نمبر ص ۱۱۷، محمد ایوب قادری۔

حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ

آپ ۱۲۳۳ھ میں موجودہ اتر پردیش کے ضلع مظفر نگر کے تھانہ بھون میں پیدا ہوئے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں مولانا نصیر الدین دہلوی[۱] کے ہاتھ پر سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت کی۔ پھر شیخ نور محمد جھنجانوی[۲] سے چاروں سلسلوں میں بالعموم اور طریقۂ چشتیہ صابریہ میں بالخصوص تکمیل سلوک کیا۔ ۱۲۶۱ھ میں مناسکِ حج ادا کئے۔ اس وقت شاہ محمد اسحاق بقید حیات تھے جو خانوادۂ شاہ ولی اللہ کے نمائندہ تھے۔ حاجی صاحب نے ان سے بھی فیض و فوائد حاصل کئے۔ ہندوستان واپس آکر آپ نے رُشد و ہدایت کا سلسلہ شروع کیا۔ کئی برگزیدہ ہستیاں آپ کے حلقۂ بیعت میں داخل ہوئیں۔ ان میں مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری شامل ہیں۔ یہ واضح نہیں ہو سکا کہ مولانا امداد اللہ نے مولانا مملوک علی کی جگہ کب لی؟ غالباً یہ ۱۸۴۶ء کے قریب کا زمانہ ہوگا کیونکہ دونوں ہی تقرریاں شاہ محمد اسحاق نے کیں جو ۱۸۴۱ء میں حجاز مقدس کو ہجرت کر گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی روانگی کے بعد بہت جلد تبدیلیاں نہیں کی ہوں گی۔

تحریک آزادی کے آغاز پر جب ہر طرف بد انتظامی پھیلی تو تھانہ بھون میں بھی یہی صورت دیکھنے میں آئی۔ مولانا نے ممتاز علماء کا ایک اجلاس منعقد کیا

۱؎ یہ مولانا شاہ محمد اسحٰق کے داماد اور شاگرد تھے اور بالاکوٹ کے واقعہ کے بعد سید احمد بریلوی کی تحریکِ آزادی میں ایک نئی روح پھونکی تھی۔

۲؎ یہ بھی سید احمد بریلوی کے ایک خلیفہ تھے۔

اور جہاد کی تنظیم کی۔ علماء نے آپ کو اپنا قائد چُنا[1] شروع میں اختلاف رائے پایا گیا کہ فرنگیوں سے لڑنے کے لئے وسائل کی کمی ہے لیکن بعد میں اس اعتراض کو جلد ہی مسترد کر دیا گیا[2]۔ مولانا نے تھانہ بھون کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا اور دیوانی و فوجداری کے جُملہ مقدمات شرعی فیصلہ کے موافق چند روز تک قاضی شریع بن کر فیصل بھی فرمائے[3]۔ ان کوششوں میں مولانا محمد قاسم، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی حمایت بھی آپ کو حاصل تھی۔ ان حضرات کو فرنگیوں کے علاوہ عام قانون شکنوں کا بھی سامنا تھا جن کے غول کے غول پھرتے تھے۔ ایک موقع پر ان سے مقابلہ بھی ہوا اور مولانا محمد قاسم گولی لگنے سے زخمی بھی ہوئے۔

تھانہ بھون کے مجاہدین نے مولانا امداد اللہ کی قیادت میں شاملی کی طرف کوچ کیا اور اس پر قبضہ بھی کر لیا۔ جب فرنگیوں نے ہر طرف دوبارہ قبضہ کر لیا تو مولانا امداد اللہ کی گرفتاری کے لئے بڑی کوششیں کیں لیکن آپ چھُپتے چھپاتے مکہ معظمہ چلے گئے اور وہیں فیوض و برکات کا سلسلہ جاری کیا۔ مولانا گنگوہی اور مولانا محمد قاسم یہاں بھی آپ سے خاص ارتباط رکھتے تھے۔ مستقبل کے لائحہ عمل کے لئے دوبارہ صلاح مشورے ہوتے[4]۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ نے مکہ معظمہ میں برصغیر کے دینی حلقوں میں فرنگیوں کے خلاف نفرت کی شمع جلائے رکھی۔ ۱۳۱۷ھ میں وہیں مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

---

[1] علماء کا شاندار ماضی، جلد پنجم، ص ۳۰۱، محمد میاں۔

[2] ایضاً ص ۳۰۰

[3] موج کوثر ص ۱۹۵

[4] مولانا عبیداللہ سندھی، ص ۳۸۹، محمد سرور

نواب تفضّل حسین خاں

آپ کا شمار اودھ کے ممتاز جاگیرداروں میں ہوتا تھا۔ باعمل عالم بھی تھے اور تجربہ کار جرنیل بھی۔ فرخ آباد کے باسی اپنے جوشیلے پن کی وجہ سے مشہور تھے۔ ۱۸ جون تک ادھر امن رہا لیکن یک لخت سپاہیوں نے فرنگی افسروں کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور نواب تفضّل حسین کو اپنا حاکم مقرّر کر لیا۔ فرخ آباد سے صرف تین میل کے فاصلے پر دریائے گنگا کے کنارے فتح گڑھ تھا۔ یہاں فرخ آباد کی چھاؤنی کے علاوہ ایک مستحکم قلعہ بھی تھا۔ جب سیاہ بگڑی تو کمانڈر کرنل جان اسمتھ تقریباً ایک سو ہم وطنوں کے ساتھ قلعہ نشین ہو گیا۔ قلعہ پر توپیں نصب کرنے کے علاوہ سامان حرب بھی کثیر تعداد میں وہاں جمع کر لیا۔

مجاہدین نے ۲۵ جون کو قلعہ پر حملہ کیا۔ فصیل پار کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ پھر پاس کے ایک گاؤں حسین پور کے اونچے مکانوں پر سے قلعے پر فائرنگ کی گئی، اس کے علاوہ سرنگیں لگا کر ان میں بارود بھی بھری گئی۔ متعدد فرنگی مارے گئے لیکن گولہ باری سے قلعہ کی محض بیرونی دیوار کو نقصان پہنچا جب کہ اندرونی دیوار بدستور سلامت رہی

۳ جولائی کی شب محصور فرنگیوں نے سامان جنگ تباہ کیا اور دو بجے کے قریب قلعے کی دیوار سے لگی کشتیوں میں سوار ہو کر فرار ہوئے۔ پہچانے گئے، مجاہدین نے گولیاں چلائیں لیکن یہ لوگ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ اب گرد و نواح میں بھی نواب تفضّل حسین کا اقتدار قائم ہو گیا تو آپ نے ٹانڈا کے راجہ میر عباس علی سے مل کر گورکھپور سے فرنگیوں کو نکالا۔

فرنگیوں نے دہلی سے تازہ دم افواج بھیجیں۔ کسُمی کے جنگل میں ڈٹ کر مقابلہ ہوا۔

نواب صاحب کے سپاہی از حد جاں نثار تھے۔ انہوں نے فرنگی فوج کو گاجر مولی کی طرح کاٹ پھینکا۔ اس لڑائی میں ایک فرنگی افسر کی بندوق کی گولی سے نواب صاحب کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ یہی زخم بعد میں گرفتاری میں ممد ثابت ہُوا۔

اگلی لڑائی ۷ دسمبر کو پٹیالی کے قریب ہُوئی جس میں مجاہدین کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر فرخ آباد کے قرب وجوار میں لڑائی ہوئی۔ گھمسان کا رن پڑا لیکن بدقسمتی سے مجاہدین کو اس بار بھی شکست ہوئی۔ فرنگیوں نے شہر پر قبضہ کرلیا جہاں قتل و غارت کے ساتھ ساتھ لوٹ کھسوٹ کا بازار بھی گرم ہوا۔ نواب صاحب کا محل مسمار کر دیا گیا، البتہ آپ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور بیگم حضرت محل کے کیمپ واقع بونڈی میں شامل ہو گئے۔ جب ان افواج کو بھی شکست ہوئی تو نواب صاحب نے جاں بخشی کے وعدے پر ہتھیار ڈال دیئے۔ مقدمہ چلا اور پھانسی کی سزا تجویز ہوئی جو بعد میں موقوف کر دی گئی۔ اس کے بعد نواب صاحب مکہ معظمہ چلے گئے اور وہیں فوت ہُوئے۔



مُنشی رسُول بخش کاکوروی

آپ کے مورث اعلیٰ ابوبکر حاجی علوی کے صاحبزادے ملک بہاء الدین سلاطین شرقیہ کی طرف سے کاکوری فتح کرنے کی غرض سے آئے اور فتح کے بعد وہیں مقیم ہوگئے۔ منشی رسول بخش کے والد فیض بخش سپاہی ہونے کے ساتھ ساتھ "چشمۂ فیض" نامی ایک کتاب کے مصنف بھی تھے۔ منشی رسول بخش بھی نواب واجد علی شاہ کی فوج میں ملازم تھے اور اُن کی معزولی کے بعد یہ اپنے وطن چلے گئے۔

آپ فرنگیوں کے سخت دُشمن تھے اور اُن کا تختہ اُلٹنے کے لئے آپ نے اپنے ہم خیال افراد کو جمع کرنا شروع کیا۔ آپ نے تحریکِ آزادی کے قائدین سے بھی مُلاقاتیں کیں جن میں عظیم اللہ بھی شامل تھے۔ آپ نے اودھ کی چھاونیوں کے مختلف افسروں سے مل کر انہیں جہاد کے لئے تیار کیا اور ان کی ماتحت فوج کے لئے تنخواہ کا بھی انتظام کرلیا تھا۔ میرٹھ میں تحریک کے آغاز کے دوسرے روز فوجیں لکھنؤ میں داخل ہونے والی تھیں۔ مُنشی رسول بخش کے کئی اہلکاروں کے ساتھ تعلقات تھے، ان میں سے پولیس کے ایک اہلکار نے کرنل بیلی کے پاس جاکر آپ کی سرگرمیوں کے بارے میں مطلع کردیا۔ آپ بڑے فرزند منشی عبدالصمد اور دیگر شریک کار ۱۸ نفوس سمیت گرفتار کرلئے گئے۔ ان تمام کو شاہ پیر محمد کے ٹیلہ پر پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔ نیز آپ کے خاندان کے تمام افراد کو گرفتار کرنے کا حکم بھی دے دیا گیا۔

آپ کے دوسرے دو فرزندوں مُنشی عبدالحی اور مُنشی عبدالعزیز کو کاکوری میں اس سانحۂ ارتحال کی اطلاع ملی تو وہ باقی اہل خاندان کے ساتھ گھر چھوڑ کر روپوش

ہونے کی غرض سے نکل کھڑے ہوئے۔ شاہ تراب علی سجادہ نشین تکیہ شریف کاظمیہ کاکوری نے اپنے مکان کے زنانہ حصہ میں کئی ماہ تک ٹھہرائے رکھا اس کے بعد سندیلہ جاکر اپنے ایک عزیز کے ہاں روپوش ہوئے۔ تحریکِ آزادی کا زور کم ہوا تو ایک روز لکھنؤ کے چیف کمشنر کو منشی رسول بخش کے برادر نسبتی کے بیٹے نواب اکرام خاں[1] نے حالات پر قابو پانے کا مشورہ دیا کہ اگر منشی رسول بخش کی لگائی ہوئی آگ کو بجھانا مشکل کام ہے تو اُن کی اولاد بھی کافی اثرورسوخ کی مالک ہوگی، حکومت کو اُن کے اہل خاندان کی معافی کا اعلان کر دینا چاہیئے بعد میں اُن کی اولاد سے یہ کام لینا چاہیئے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ عبدالحی عرشی نے تمام جاگیرداروں کو موافق بنایا لیکن صلے میں کچھ قبول نہ کیا بلکہ تمام عمر لکھنؤ میں وکالت کی[2]

---

[1] بعد میں ریاست حیدرآباد میں صوبیدار ہوئے اور نواب بار جنگ کا خطاب پایا۔

[2] مفتی انتظام اللہ شہابی کا مقالہ، العلم، جنگِ آزادی نمبر ص ۱۰۸

مولانا سرفراز علی

آپ امام المجاہدین کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کا تعلق شاہ جہان پور سے تھا اور سید احمد شہید کے مرید تھے۔ ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی شروع ہونے سے قبل کئی علماء اس میدان میں مستعد تھے۔ ان میں مولانا سرفراز علی سرفہرست تھے[1]۔ آپ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ جہاد کی بیعت بھی لیتے۔ آپ کے مریدوں میں فوجی بھی شامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فوجیوں میں آپ کا اثر و رسوخ کافی تھا ایک روایت کے مطابق بہادر شاہ ظفر بھی آپ کے مرید تھے۔ وہ آپ کو شجرہ کے ساتھ سرخ رومال اور پانچ روپے وظیفہ دیتے تھے۔ جب آپ سلطان پور گئے تو بخت خاں آپ کے حلقۂ بیعت میں شامل ہوئے۔

اودھ میں آپ نے لوگوں کے اندر جذبۂ جہاد بیدار کیا۔ مولانا احمد اللہ شاہ کے بعد یہی وہ واجب التعظیم شخصیت ہے جس نے دِلّی اور لکھنؤ کے لئے ہزارہا مجاہدین تیار کئے، چنانچہ ان کو امیر المجاہدین کا لقب دیا گیا[2]۔ بعد میں آپ نے بخت خاں اور مفتی عنایت احمد کی معیت میں دہلی کا سفر اختیار کیا۔ مفتی صاحب سرکاری ملازم تھے اس لئے خفیہ طور پر کام کرتے تھے۔

مولانا سرفراز علی پوری تحریک کے دنوں میں مستعد رہے۔ شاہ جہان پور

---

[1] العلم، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۸ء، ص ۸۴

[2] مفتی انتظام اللہ شہابی کا مقالہ، العلم، جنگ آزادی نمبر ص ۱۰۶

میں بھی آپ کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے[1] جب فرنگیوں نے لکھنؤ پر قبضہ کیا تو مولانا سرفراز علی بھی گرفتار ہوئے۔ انہیں بھی کالے پانی بھیج دیا گیا۔

---

[1] FREEDOM STRUGGLE IN UTTAR PARDASH, V.P. 297

ULEMA IN POLITICS, P.209.

دیگر مجاہدین

۱۸۵۷ء کا جہادِ آزادی مسلمانانِ برِصغیر پاک و ہند کی وہ منظم اور ہمہ گیر تحریک تھی جس کے ذریعہ انہوں نے فرنگی استعمار کا جُوا اُتار پھینکنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس تحریک میں بیشمار ایسے مجاہدین نے قربانیاں دیں اور صعوبتیں برداشت کیں جو غیور اور جسور تھے۔ وہ وطن کے گلشن کی اپنے خون سے آبیاری کرنے کے بعد تاریخ کے اوراق میں خاموشی سے گم ہو گئے۔ انہوں نے اپنا فرض پہچانا اور اس کی بجاآوری کی پوری کوشش کی۔ ان کے ذرائع محدود تھے لیکن مقصد عظیم تھا۔ دہلی میں کئی مجاہدین جامع مسجد میں بغیر کچھ کھائے پیئے پڑے رہتے، اگر کچھ مل جاتا تو کھا لیتے اور رات جلد گزر جانے کی دعا مانگتے۔ نماز فجر کے بعد وہ ہتھیار بند ہوتے اور شہادت کی تلاش میں نکل پڑتے تھے[1] اس تحریک میں مختلف مکتب ہائے فکر کے علماء مستعد ہو گئے اور اپنے پیروکاروں کو جہاد کی تبلیغ کرنے میں دن رات ایک کر دیا۔ وہ فقیروں کا بھیس بدل کر عوام میں جوش پیدا کرتے تھے[2] علماء کو وہابی کہا گیا لیکن انہوں نے کسی چیز کی پرواہ نہ کی۔ عوام و خواص میں ناقوس حریت پھونکنے والے یہی حضرات تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے فرنگیوں کی دشمنی میں ہندو والیانِ ریاست کا بھی ساتھ دیا۔ جب رانی جھانسی نے میدان جنگ میں قدم رکھا تو علماء نے اس کی کامیابی کے لیے دعائیں کیں۔ اسی طرح جب وہ جھانسی سے مجبور

---

[1] ULEMA IN POLITICS, P.374–75

[2] علماء کا شاندار ماضی، جلد پنجم، ص ۱۱۳

ہو کر نکلی تو تین سو افغان سپاہی اسے اپنے جھرمٹ میں لئے ہوئے تھے۔ اس باب میں چند ایک مجاہدین کی کوششوں کی تفصیل سپردِ قلم کی جاتی ہے، ان کے علاوہ مولانا فضل امام خیرآبادی، مفتی صدر الدین آزردہ، مولانا فضل رسول بدایونی، مفتی انعام اللہ، مولانا مفتی لطف اللہ، مولانا غلام قادر، مولانا شاہ احمد حسن، حافظ محمد ضامن، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا امام خاں رسالدار، مولانا عبدالغفار، مولانا رشید احمد گنگوہی اور کئی ایک ایسی ہستیاں ہیں جنہوں نے تحریک کے لئے جان و مال کی قربانی دی۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی آپ ضلع مظفر نگر کے پرگنہ کیرانہ کے سپوت تھے۔ باعلم عالم تھے۔ جب تحریکِ آزادی کا آغاز ہوا تو آپ دہلی چلے آئے اور قلعہ کے پاس مولانا محمد حیات کی مسجد میں اترے۔ لیکن جلد ہی آپ نے یہ محسوس کر لیا کہ دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی بلکہ محض ایک ہنگامہ تھا۔ چنانچہ آپ کیرانہ واپس چلے آئے اور وہاں تحریک میں موثر روح پھونکنے کی کوشش کی۔ جلد ہی تحریک مقبول عام ہو گئی۔ ان دنوں کیرانہ کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ کی آواز پر لوگوں کو جمع کیا جاتا اور اعلان ہوتا تھا:

ملک خدا کا اور حکم مولوی رحمت اللہ کا

اس اعلان کے بعد جو کچھ کہنا ہوتا تھا اس سے عوام کو مطلع کیا جاتا۔ کیرانہ میں لوگوں میں دینداری کے ساتھ از حد جوش بھی تھا۔ تھانہ بھون اور کیرانہ کا ایک محاذ قائم کیا گیا۔ اس طرح تھانہ بھون میں مولانا حاجی امداد اللہ اور مولانا عبدالحکیم اور نواح کیرانہ میں مولانا رحمت اللہ فرنگی فوج کا مقابلہ کر رہے تھے۔ بظاہر مجاہدین کی پوزیشن کافی مستحکم تھی لیکن غداروں کی وجہ سے صورت حال تبدیل ہو گئی۔ مولانا رحمت اللہ کو گرفتار کرنے کے لئے کیرانہ کے محلہ دربار کا محاصرہ کیا گیا، گھر گھر کی تلاشی لی گئی لیکن مولانا ایک قریبی دیہات پنجیٹھ پہنچ چکے تھے جہاں

آپ کو کیرانہ کے قُرب و جوار کی اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ اسی دوران میں فرنگی فوج کا ایک گھوڑ سوار دستہ پنجیٹھ کی طرف روانہ ہُوا تو گاؤں کے مُکھیا نے مولانا اور اُن کے رُفقاء کو منتشر کر دیا۔ مُکھیا کے مشورے پر مولانا کھیتوں میں گھاس کاٹنے میں مصرُوف ہو گئے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ میں گھاس کاٹ رہا تھا اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے جو کنکریاں اڑتی تھیں وُہ میرے جسم پر پڑتی تھیں۔ پُورے دیہات کی تلاشی لی گئی، مُکھیا کو حراست میں لے لیا گیا لیکن مولانا نہ ملے۔

جب فرنگیوں نے حالات پر قابُو پا لیا تو مولانا پر غیر حاضری میں مقدمہ چلایا گیا اور آپ کی گرفتاری کے لئے ایک ہزار روپے کا انعام مُقرر کیا گیا۔ مولانا نے اپنا نام مصلح الدین رکھا اور بھیس بدل کر دہلی چلے گئے جہاں سے حجازِ مقدس جانے کے لیئے جے پور اور جودھ پور کا راستہ اختیار کیا۔ وہاں سے سُورت گئے اور اس طرح مکہ معظمہ چلے گئے۔[1] فرنگیوں نے مولانا اور اُن کے خاندان کی املاک ضبط کر کے نیلام کر دی گئی۔ جو جائداد پانی پت میں نیلام ہُوئی وہ لاکھوں روپے کی مالیت کی تھی لیکن محض ایک ہزار چار سو بیس رُوپے میں نیلام ہوئی۔

نواب مموّ خاں

ان کا اصلی نام علی محمد خاں تھا۔ حکومت اوُدھ کے افسرِ اعلیٰ تھے۔ جب تحریک آزادی کا آغاز ہُوا تو بیگم حضرت محل کے معتمد باختصاص مُقرر ہوئے۔ بدقسمتی سے نواب موصوف اور مولانا احمد اللہ شاہ کے درمیان موافقت نہ تھی۔ اس وجہ سے اوُدھ میں مجاہدین کے موقف کو سخت دھچکا لگا۔ یہ مولانا ہی کا حصّہ تھا کہ جب نواب مموّ خاں کو جہاد میں حِصّہ لینے کی اجازت ملی تو انہوں نے ہر ممکن طریقے سے تعاون کیا۔ اگرچہ نواب موصوف نے مولانا کو ہر موقعہ پر نیچا دکھانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے بیگم حضرت محل

---

[1] THE GREAT REVOLUTION OF 1857,
SYED MOINUL HAQ. P.385–387.

کے ساتھ بڑی وفاداری اور جاں نثاری کا ثبوت دیا۔

اودھ میں تحریک کی ناکامی کے بعد نواب ممّو خاں بھی نیپال چلے گئے جہاں رانا جنگ بہادر نے انہیں برضا و ترغیب نیپال سے چلے جانے کو کہا۔ دوسری طرف فرنگی نواب ممو خان کو گرفتار کرنا چاہتے تھے رانا جنگ بہادر نے انگریزوں کی یہ مشکل حل کر دی، اور اس نے نواب ممّو خاں سے تعلقات بڑھانے شروع کئے۔ اکثر ملاقاتیں ہوتیں ایک روز حسبِ معمول باتیں کرتے کرتے رانا جنگ بہادر نواب ممّو خاں کو ایک ایسی جگہ لے آیا جہاں ہیل نامی ایک فرنگی چند ساتھیوں کے ساتھ عربی لباس پہنے ہوئے چھپا بیٹھا تھا۔ اشارہ پاکر فرنگیوں نے نواب کو اپنی گرفت میں کر لیا۔ گرفتار ہو کر لکھنؤ لائے گئے جہاں پھانسی کی سزا سنائی گئی لیکن فرنگیوں نے ایسے بڑے "مجرم" کے لئے یہ سزا ناکافی خیال کرتے ہوئے حبس دوام بہ عبورِ دریائے شور میں تبدیل کر دی۔ سرامک میں فوت ہوئے۔

دیوان حکمت اللہ خاں

فتح پور میں ڈپٹی مجسٹریٹ تھے۔ ۹ جون کو یہاں تحریک کا آغاز ہوا تو اس کے قائد آپ ہی تھے فتح پور میں تحریک کے ذمہ دار دو گروہ تھے ایک الٰہ آباد سے آیا تھا اور دوسرا کان پور سے۔ فتح پور میں مشنریوں کی سرگرمیوں کا یہ عالم تھا کہ بنارس کے کمشنر ہنری ٹکر کے بڑے بھائی رابرٹ ٹکر، جو جج تھا، نے فتح پور کے ایک گیٹ پر چار سنگین ستون نصب کروا رکھے تھے۔ دو ستونوں پر دس موسوی احکام فارسی اور ہندی میں کندہ کرا دیئے تھے اور دو پر انجیل کی کچھ عبارتیں لکھوا رکھی تھیں۔ اہل شہر کے جذبات اس مسئلے پر پہلے ہی برانگیختہ تھے۔ تحریک کے آغاز نے اس پر جلتی پر تیل کا کام کیا، انہوں نے خزانہ لوٹ لیا۔ جیل خانہ توڑ کر قیدیوں کو چھڑا لیا گیا۔ مشنریوں کی عمارات نذرِ آتش کر دی گئیں۔ سرکاری عمارات کے ریکارڈ بھی جلا دیئے گئے۔ رابرٹ ٹکر کے سوا سب فرنگی منتشر ہو گئے۔ ٹکر مارا گیا۔

جب دہلی میں بخت خاں کے کاز کو نقصان پہنچا تو مولانا فیض احمد اور ڈاکٹر وزیر خاں، جو طویل عرصے سے جرنیل کے ساتھی تھے، بھی لکھنؤ اُٹھ آئے۔ اور مولانا احمداللہ شاہ کی کمان میں لڑے۔ سقوطِ لکھنؤ کے بعد دونوں بدایوں چلے گئے

اور شہزادہ فیروز شاہ کے دوش بدوش لڑائی میں حصّہ لیا۔ جب وہاں بھی لڑائی ناکامی میں بدل گئی تو محمدی چلے گئے اور دوبارہ مولانا احمداللہ شاہ کے ساتھ مل گئے۔ مولانا کی شہادت کے بعد مولانا فیض احمد مکمل طور پر غائب ہو گئے۔ آپ کے اہلِ خاندان نے آپ کو قسطنطنیہ (استنبول) تک تلاش کیا لیکن اُن کو کامیابی نہ ہوئی[۱]

مولانا رضی اللہ آپ بدایوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ممتاز عالمِ دین تھے اور اپنے علم کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے۔ بدایوں کے کلکٹر کارمیکل نے عربی سیکھنے کے لئے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ مولانا نے تحریکِ آزادی میں بھرپور حصّہ لیا اور جہاد کی رُوح پھونکی۔ تحریک کی ناکامی کے بعد گرفتار ہوئے تو صاف اقبالِ جرم کیا۔ کلکٹر نے کاروائی ملتوی کی اور کہلا بھیجا کہ جرم سے انکار کر دیں تو بچ جائیں گے۔ مگر دُوسرے روز دوبارہ اقبالِ جرم کیا۔ مجبوراً کلکٹر کو سزائے موت کا فیصلہ دینا پڑا۔ جب گولی ماری جانے لگی تو کارمیکل اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور رِقّت آمیز لہجے میں آپ سے استدعا کی کہ اب بھی اگر آپ تحریک میں شرکت کے جرم سے انکار کر دیں تو میں آپ کو موت سے بچا لوں گا۔ اس پر مولانا نے بڑی ترشروئی سے کہا کہ میں تمہاری وجہ سے اپنا ایمان اور اپنی عاقبت خراب کر لوں؟

یہ کہہ کر بخوشی جان دے دی[۲]

---

[۱] علماء کا شاندار ماضی، جلد پنجم، ص ۳۹۳ - ۳۹۹

[۲] مسلمانوں کا شاندار مستقبل ص ۱۳۲

رسالدار میجر محمد شفیع

روہیل کھنڈ میں تحریک آزادی کے رُوح رواں دو اصحاب تھے یعنی بخت خاں اور محمد شفیع۔ موخر الذکر ۱۸ ویں بے قاعدہ رسالے میں رسالدار میجر تھے۔ آپ نے اوائل مئی میں فرنگیوں کو یہ یقین دلایا کہ رسالہ کسی صورت بھی اُن کے خلاف ہتھیار نہ اُٹھائے گا[1] لیکن بعد میں حالات بدل گئے اور ۳۱ مئی کی رات کو محمد شفیع نے سپاہیوں کو للکار کر کہا کہ اپنے دین کے لئے مر جاؤ اور فرنگیوں کو مار ڈالو۔ ان سواروں نے جھپٹ کر برگیڈیر سیبلڈ، کرنل ٹراپ کپتان رابرٹ اور کپتان کربی وغیرہ کو کاٹ پھینکا۔ حقیقت یہ ہے کہ کپتان میکنزی کی کوششوں کو ناکام بنانے کے سب سے بڑھ کر ذمہ دار آپ ہی تھے۔ بریلی کے آزاد کرانے میں بھی آپ کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی

آپ شعبان یا رمضان ۱۲۴۸ھ میں نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دیوبند اور سہارن پور میں حاصل کی۔ پھر مولانا مملوک علی نے دہلی کالج میں داخل کرایا۔ جب سالانہ امتحانات قریب آئے تو آپ نے کالج چھوڑ دیا۔ آپ کی ذہانت اور فطانت کے باعث سب اساتذہ کو آپ کے کالج چھوڑنے کا افسوس ہُوا۔

تحریک آزادی کا آغاز ہُوا تو آپ نے اس میں بھرپور حصہ لیا۔ شاملی پر قبضہ کرنے والے مجاہدین کی قیادت کرنے والے قائدین میں آپ بھی شامل تھے۔ سقوط دہلی کے بعد آپ کے وارنٹ گرفتاری جاری ہونے، انعام بھی مقرر ہُوا۔ احباب نے رو پوش ہونے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ روپوش ہو گئے لیکن چوتھے روز باہر نکل آئے۔ اور وجہ یہ بتائی کہ تین روز سے زائد روپوش ہونا سُنّت طیبہ سے ثابت نہیں ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی صرف

---

[1] میلی سن جلد سوم ص ۳۴۵ - ۳۴۶

تین روز ہی غار ثور میں چھپے تھے۔

ایک فرنگی افسر جو آپ کے تعاقب میں تھا ایک دن آپ کے بالکل قریب ہی پہنچ گیا اور آپ سے آپ کے متعلق ہی دریافت کیا۔ آپ مطلق نہ گھبرائے اور وہاں سے دو قدم ہٹ کر فرمایا: "ابھی تو وہ یہاں کھڑا تھا!" یہ جواب سن کر وہ فرنگی وہاں سے چلا گیا۔

مولانا وہاج الدین آپ مولانا منو کے نام سے معروف تھے۔ ضلع مُرادآباد میں آپ نے جہاد کی ایک نئی رُوح پھونکی جس کا یہ اثر تھا کہ جب شہزادہ فیروز شاہ مُرادآباد آئے تو شہر کے سولہ ہزار افراد نے تقسیم شرعی ایک محضر نامے پر شرکت کے واسطے دستخط کر دیئے۔[1]

مولانا وہاج الدین نے رام گنگا کے کناروں پر سبز پرچم لہرایا۔ بدقسمتی سے آپ رام پور کے مجاہدین کے ساتھ شریک ہونے سے قبل ہی جدوجہد میں چل بسے، اس کے باوجود تحریک آزادی پروان چڑھتی رہی۔ تحریک کے بعض قائدین کا مولانا پر اعتماد تھا اور انہوں نے اُن کے کاز کو بڑھانے میں کام کیا۔[2]

وارث علی یہ پولیس میں جمعدار تھے۔ پٹنہ میں تحریک کے دبائے جانے کے بعد جب گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ۲۲ جون کو مظفر پور میں پولیس نے انہیں گرفتار کیا۔ ان کے پاس سے جو دستاویزات برآمد ہوئیں ان سے کئی ایک مجاہدین کا پتہ چلا۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وارث علی نے گیا میں علی کریم نامی ایک شخص کو انقلاب برپا کرنے کے متعلق خط لکھا تھا۔ وارث علی کو اس جرم میں پھانسی دے دی گئی۔ جب پولیس علی کریم کو گرفتار کرنے کے لئے گئی تو دیہاتیوں نے پولیس کو بہکا کر غلط راستے پر ڈال دیا اور علی کریم بچ نکلے۔

---

[1] اخبار الصنادید جلد دوم ص ۱

[2] THE GREAT REVOLUTION OF 1857,
SYED MOINUL HAQ. P.539–543.

بازخان[1]

یہ دسمبر کی ایک سرد اور تاریک شب تھی، مری برف کی چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ ڈنڈوں، چھریوں، کلہاڑیوں، چاقوؤں اور تلواروں وغیرہ سے مسلح تقریباً تین سو افراد، جو اس پہاڑی علاقے سے تعلق رکھتے تھے، کلڈانا روڈ پر واقع کرنل بیٹی کے ہیڈکوارٹرز کی طرف احتیاط سے بڑھ رہے تھے۔ اُن کے چہروں پر کمال کا عزم تھا۔ اس جگہ گھنا جنگل تھا۔ ان کا مقصد کرنل بیٹی کی فوج کو نیست و نابود کرنا تھا۔

اس حملہ آور جمعیت کے قائد باز خان تھے جن کا تعلق ڈھونڈ قبیلہ سے تھا جو اس علاقہ میں بڑا با اثر تھا۔ اگرچہ دشمن کی تعداد کا بڑا محتاط اندازہ لگایا گیا تھا اور حملے کا منصوبہ بہترین طریقے سے مرتب کیا گیا لیکن باز خاں اور اُن کے رفقا کی قسمت نے یاوری نہ کی۔ فرنگی ہیڈکوارٹرز میں ۵۰۰ تربیت یافتہ اور بہترین ہتھیاروں سے مسلح فوجی بالکل چوکنا موجود تھے۔ بہت جلد مقابلہ یک طرفہ معاملہ ہو کر رہ گیا۔ حریت پسند بے جگری سے لڑے لیکن اُن کو بھاری نقصانات اُٹھانا پڑے۔ کئی ایک گولی کا نشانہ بنے اور بیشمار کو قیدی بنا لیا گیا جن پر بعد میں محض دکھلاوے کی خاطر مقدمہ چلایا گیا اور نتیجے میں گولی کا نشانہ بنے۔

جو کچھ ہوا باز خاں اس کے متعلق سوچ بھی نہ سکتے تھے۔ دو روز قبل کرنل بیٹی کے پاس کُل دو سو افراد تھے اور باز خاں نے حملے کے منصوبے مکمل رازداری برتی تھی۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرنگیوں کو اس حملے کے متعلق کس طرح علم ہوا۔

ہوا یوں کہ ایک عورت، جس کا نام دادی سونو تھا اور جس کا اکلوتا لڑکا کرنل بیٹی کے ہاں ملازم تھا، نے حملے کا سنا تو اس کی ممتا کو اپنے لڑکے کا خیال آیا۔ وہ اُسے بچانے کے لئے تیزی سے کرنل کی رہائش گاہ پر گئی۔ جب وہ اپنے بیٹے کو اس

---

[1] یہ مضمون روزنامہ پاکستان ٹائمز راولپنڈی کے کسی شمارے میں شائع ہوا۔ صاحبِ قلم اور تاریخ اشاعت مصنّف کے ذہن سے فراموش ہو چکے ہیں۔

حملے کا بتا رہی تھی تو کسی نہ کسی طرح کرنل بیٹی کو بھی آگاہی ہو گئی۔ حملے میں ایک دن باقی تھا، اُس نے تیزی سے راولپنڈی سگنل دیا اور وہاں سے وقت پر کمک آگئی۔

باز خان کو زندہ گرفتار کر لیا گیا۔ باقی مجاہدین پر برائے نام مقدمہ چلایا گیا اور پھر اُن کو ایک کھلے میدان میں کھڑا کر کے گولی مار دی گئی۔ یہ جگہ آج کل آرمی گراؤنڈ کہلاتی ہے چونکہ باز خان کا تعلق ایک بااثر قبیلہ سے تھا اس لئے انہیں جزائر انڈیمان میں بھیج دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں انہوں نے شادی کی اور وہیں آباد ہو گئے۔

راجہ علی خاں بنگال کے مشرقی علاقے طویل فاصلے اور آمد و رفت کے نامناسب ذرائع کی وجہ سے تحریک آزادی سے زیادہ متاثر ہوئے۔ البتہ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بنگالی چھاونیوں میں مقیم رجمنٹوں کا مجاہدین کے ایلچیوں سے رابطہ ضرور قائم ہوا ہو گا۔ چٹاگانگ میں مقیم ۳۴ویں این آئی کی چند کمپنیوں نے عَلمِ جہاد بلند کیا، تقریباً ۳ لاکھ روپے خزانے سے لُوٹ لئے اور جیل توڑ کر قیدیوں کو چھڑا لیا۔ فرنگی افسروں کے مکانات کو آگ لگانے کے بعد انہوں نے سلہٹ کی راہ لی۔ ان مجاہدین کی قیادت راجہ علی خاں کر رہے تھے جو کمپنی ۴ کے حوالدار تھے۔

سلہٹ جانے کے لئے ان مجاہدین کو طویل راستہ اختیار کرنا پڑا کیونکہ ان کی راہ میں راجہ آف تیراہ کے لوگوں نے رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ دریں اثنا فرنگیوں کے لئے کمک پہنچ گئی۔ لاٹو کے دیہات کے قریب دونوں افواج کا سامنا ہوا۔ ۱۸ دسمبر ۱۸۵۷ء کو فرنگی میجر بیننگ مارا گیا۔ مجاہدین نے جنگلوں کی راہ لی اور منی پور جا پہنچے۔ ۲۲ جنوری ۱۸۵۸ء کو سلہٹ کور کے ایک دستے نے کیپٹن سٹوئز کی سرکردگی میں مجاہدین پر حملہ کیا۔ مجاہدین بھاگنے پر مجبور ہو گئے اور بعد میں پہاڑی علاقے کی طرف چلے گئے جہاں بہت سے تباہ و برباد ہو گئے۔

ٹھیکیدار محمد شفیع آپ کا تعلق دہلی کے ایک تاجر خاندان سے تھا۔ اسی وجہ سے ان کے خاندان والوں کے فرنگی حکام کے ساتھ بڑے گہرے

روابط تھے۔ آپ کے جدامجد معمولی چرواہے تھے جنہوں نے اپنی دانشمندی اور کفایت شعاری سے جنگی حالت سے فائدہ اُٹھا کر کافی دولت پس انداز کی تھی یہ زمانہ وارن ہیٹنگز اور کارنوالس کا تھا۔ فوج کے محکمہ سپلائی نے ان سے تعلقات بڑھائے، اس طرح اُن کو بڑے بڑے ٹھیکے ملنے شروع ہوئے۔ اس تجارت میں محمد شفیع کے والد نے اور بعد میں آپ نے خود خوب اضافہ کیا۔ آپ پنجاب میں فرنگی افواج کو گوشت مہیا کیا کرتے تھے اور ہندوستان کے تمام شہروں میں آپ کی ایجنسیاں تھیں۔ آپ نے پنجاب کے بڑے بڑے تاجروں کے ساتھ اسی بنا پر تعلقات اُستوار کر رکھے تھے۔ آپ کے ملازمین کی فوج پورے شمالی ہند میں پھیلی ہوئی تھی۔

تحریک آزادی شروع ہوئی تو آپ مولانا یحیٰی علی کے دست راست بنے۔ جہاد کے لئے اپنے پورے وسائل وقف کر دیئے۔ گرفتار ہوئے۔ فرنگی حکام نے آپ کے حقیقی برادر محمد رفیع کو پھانسی کی دھمکی دے کر آپ کے خلاف گواہ بنا ڈالا۔ پھانسی کی سزا مولانا محمد جعفر تھانیسری اور مولانا یحیٰی علی کے ساتھ ہی سنائی گئی۔ فیصلہ سنتے وقت چہرے کا رنگ تھوڑا سا بدلا تاہم ثابت قدم رہے اور مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

صوبیدار میجر ناہر خاں

ان کا تعلق ملتان کے علاقے سے تھا۔ سپاہ نے علمِ جہاد بلند کیا تو ۱۰ جون ۱۸۵۷ء کو دیسی سپاہ کو غیر مسلح کر دیا گیا۔ اسی روز ۶۹ ویں رجمنٹ کے تین چار سپاہی فرار ہو گئے لیکن ان میں سے ایک پکڑا گیا۔ اُسے پھانسی کا حکم سنایا گیا لیکن جاں بخشی کا وعدہ بھی ساتھ ہی کر دیا گیا بشرطیکہ وہ راز افشا کرے۔ اسی کے نتیجہ میں صوبیدار میجر ناہر خاں اور دیگر مجاہدین کو حراست میں لے لیا گیا۔ ۱۸ جولائی ۱۸۵۷ء کو ناہر خاں پر تین الزامات عائد کئے گئے، الزامات یہ تھے:

۱۔ اس نے ۹ جون کو فوجیوں سے کہا کہ حکام جو حکم دیں انہیں ضرور مانو لیکن اگر تمہارے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں تو جہاں جاؤ گے ملازمت حاصل کر لو گے۔

۱۲۔ اس نے ۱۱ جون کو کہا کہ رجمنٹ ۹ ، ۱۶ صبح کے وقت برباد کر دی جائے گی۔

۱۳۔ اُسے اپریل اور مئی کے مہینے میں سپاہیوں میں پھیلنے والی بے چینی کا علم تھا مگر اُس نے اپنے کمان افسر کو اطلاع نہ دی۔

ان الزامات کی بنیاد پر ناہر خاں کو ۲۴ جولائی کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔

نواب گوہر علیخاں انہوں نے ضلع سرسہ میں علم جہاد بلند کیا۔ فرنگی فوج جنرل وین کورٹ لینڈ کی زیر کمان ان پر حملہ آور ہونے کی غرض سے فیروز پور سے روانہ ہوئی اور بیکانیر کے راستہ پہلی تحصیل ڈبوالی میں قیام کیا۔ جنرل دین کورٹ لینڈ نے نواب صاحب کو دام فریب میں پھانسنے کی بھرپور کوشش کی اور غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ کیا اور اس کے لئے ایک دن کی مہلت دی۔ نواب صاحب کی غیرت ملی نے یہ گوارا نہ کیا اور اعزاز و اکرام کی بحالی کو لات ماری۔ نتیجہ میں بھٹیانہ، اوڈان اور خیر کا پر کی لڑائیاں ہوئیں۔ بھٹیانہ کی لڑائی آخری اور فیصلہ کن تھی۔ مجاہدین کی تعداد ہزاروں تک تھی مگر فرنگیوں کو زبردست توپ خانے کی برتری حاصل تھی۔ نیز بیکانیر، پٹیالہ اور نابھ کی افواج بھی اُن کی پشت پر تھیں۔ اگرچہ مجاہدین بڑی جانفشانی اور بے جگری سے لڑے لیکن فرنگیوں کا پلڑا بھاری رہا۔

اب نواب گوہر علیخاں اور اُن کے بھائی نواب لہے خان نے رانیہ میں جا کر گڑھی نواباں میں پناہ لی۔ فرنگیوں کو اطلاع ہو گئی، اُنہوں نے بیکانیری فوج کے ہمراہ پیشقدمی کی اور وہاں گولہ باری کی جس سے نوابوں کی کچہری اور محلات مسمار ہو گئے۔ نواب صاحب اپنے بھائی سمیت باہر نکل آئے اور گرفتار کر لئے گئے۔ دونوں بھائی ۱۵ اگست ۱۸۵۷ء کو سرسہ میں قلعہ کچہری میں پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔ نواباں رانیہ (سرسہ اور حصار) کی جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور اُن کے محلات اور مکانات نیلام کر دیئے گئے۔

شہزادہ محمد عظیم آپ حصار سے تعلق رکھتے تھے۔ یہاں کے لوگوں نے آپ کی قیادت میں علم جہاد بلند کیا۔ جون اور جولائی

۱۸۵۷ء میں فرنگیوں نے بھرپور تیاری کے بعد جنرل پارسن کی سرکردگی میں فیروزپور سے توپ خانے کے ساتھ ایک فوج مجاہدین کے خلاف بھیجی۔ یہ فوج بیکانیر کے راستے ہوتی ہوئی مطلوبہ جگہ پر پہنچی۔ یہاں کئی لڑائیاں لڑی گئیں جن میں سے جمال پور، توشام اور ہنگل کی لڑائیاں مشہور ہیں۔ جمال پور میں جنرل وین کورٹ لینڈ کی فوجیں بھی جنرل پارسن کے ساتھ آملیں، اوّل الذکر سرسہ پر نواب گوہر علیخاں پر حملہ کرنے گئی تھیں۔ دونوں جرنیلوں کی متحدہ فوجوں نے شہزادہ محمد عظیم اور اُن کے ہمراہی مجاہدین کو ۱۳ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شکست دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۵ ستمبر کو دو یوم کے اندر اندر فرنگیوں کا ضلع حصار ہانسی پر قبضہ ہو گیا۔ سرسہ کا ضلع توڑ دیا گیا۔ بھٹنیر کا علاقہ مستقل طور پر راجہ بیکانیر کو اور فتح آباد اور سوتر کا شمالی حصہ راجہ پٹیالہ کو ان کی خدمات کے صلہ میں دے دیا گیا۔ تحصیل فاضلکا اور ڈبوالی کا کچھ حصہ ضلع فیروزپور میں شامل کر دیا گیا۔ سرسہ اور فتح آباد کی دو نئی تحصیلیں بنا کر اُن کو ضلع حصار میں ملا دیا گیا۔



تجمّل حسین خاں

یہ فرخ آباد کے نواب تھے۔ تحریک آزادی میں حصہ لینے کی وجہ سے عمر بھر کے لئے مکہ معظمہ کو جلا وطن ہوئے۔ یہ وہی ہیں جن کے لئے غالب نے کہا تھا۔

دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے
بنائے عیش تجمّل حسین خاں کے لئے
زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے
نصیر دولت دیں اور معین ملت و ملک
بنا ہے چرخ بریں جس کے آستاں کیلئے
زمانہ عہد میں اس کے ہے محو آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسمان کے لئے
ورق تمام ہوا، اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحرِ گراں کے لئے

نواب عبدالرحمٰن

یہ جھجھر کے والی تھے۔ اُن کے سُسر عبدالصمد خاں تحریک کے بڑے سرگرم رُکن تھے جبکہ خود نواب عبدالرحمٰن کوئی سرگرم اور صاحب عزم آدمی نہ تھے۔ کھیوفلس مٹکاف دہلی سے فرار ہونے کے بعد ۱۶ مئی کو نواب صاحب کے پاس آیا جہاں تحریک کا آغاز ہونے والا تھا اور سپاہی دین دین کے نعرے لگا رہے تھے۔ نواب موصوف نے مٹکاف کو ایک صد روپے نقد پیش کئے لیکن ساتھ ہی جھجھر سے چلے جانے

کا مشورہ دیا۔ چوچک داس کے خانہ باغ میں ٹھہرنے کے بعد مٹکاف نے ہانسی کا راستہ لیا۔

یہ وہ جرم تھا جس کی پاداش میں نواب عبدالرحمٰن دھر لئے گئے۔ ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو فرنگی فوج نے جھجر پر قبضہ کیا اور نواب عبدالرحمٰن کو گرفتار کر لیا۔ پھانسی کا حکم ہوا۔ سہ پہر کا وقت مقرر ہوا۔ سپاہ کی ایک کمپنی باجا بجاتی ہوئی کوتوالی کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ نواب صاحب کی مشکیں کسی ہوئی تھیں لیکن انہیں کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ کوتوالی کے چاروں طرف فرنگی تماشائی جمع تھے۔ نواب صاحب نے نہایت استقلال کے ساتھ اپنے انجام کا سامنا کیا۔ پھانسی کے وقت آپ کی والدہ وہاں آگئیں۔ بیٹا عالم سکرات میں تڑپ رہا تھا تو عجب نالہ و فریاد سے نعش کے ساتھ لپٹ گئیں اور آغوش میں بھر لیا پھر بے دم ہو کر گر پڑیں لے نواب صاحب کو خواجہ باقی باللہ کی درگاہ کے احاطے میں سپرد خاک کیا گیا۔

مولانا محمد باقر دہلی کے ممتاز شیعہ مجتہد تھے اور فرنگیوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ اردو کے ممتاز ادیب اور شاعر مولانا محمد حسین آزاد کے والد تھے۔ ۱۸۳۶ء میں دہلی کا پہلا اردو اخبار نکالا جو ۱۳ ستمبر ۱۸۵۷ء تک جاری رہا۔ بہادر شاہ ظفر سے عقیدت کی بنا پر اپنے اخبار کی پیشانی پر "اخبار ظفر" کے الفاظ لکھ رکھے تھے حالانکہ اخبار کا اصل نام "دہلی اردو اخبار" تھا یہ اخبار انگریزوں کا زبردست ناقد تھا۔ مولانا محمد باقر نے تحریک آزادی کو جہاد قرار دیا اور اپنے اخبار کے ذریعہ اس موقف کا زبردست پرچار کیا۔ بہادر شاہ ظفر کی فوجی امداد بھی کرتے رہے۔ فرنگی مخبر جیون لال نے ۶ مئی ۱۸۵۷ء کو اپنے روزنامچہ میں لکھا:

"آج کے دن بادشاہ (بہادر شاہ ظفر) نے مولوی محمد باقر اور مولوی عبدالقادر

لے قیصر التواریخ جلد دوم ص ۵۰۶

کو بازیاب ہونے کی عزت بخشی کیونکہ انہوں نے اپنے فرائض منصبی کو نہایت ذہانت اور بہادری سے انجام دیا تھا" ۱۷ مئی کو جیون لال نے پھر لکھا: "مولوی محمد باقر نے پیدل فوج کی دو پلٹنوں اور سواروں کے ایک دستے کو حکم دیا کہ جا کر خزانے کی حفاظت کریں"

سقوط دہلی کے بعد پکڑے گئے اور گولی کا نشانہ بنے۔ ان کا تمام مال و متاع لوٹ لیا گیا اور بال بچوں کو بے آسرا سر چھپانے کے لئے دہلی سے فرار ہونا پڑا۔ فرنگیوں نے آپ کا مکان تک کھود ڈالا اور آپ کے اخبار کی جو کاپی جہاں سے ملی جلا ڈالی۔

نواب مجید اللہ خان یہ مُرادآباد کے والی تھے اور مجو خاں کے نام سے مشہور تھے۔ مولانا وہاج الدین کی وفات کے بعد مجاہدین کے قائد بنے۔ آپ کی حمایت دیگر قائدین کے علاوہ خاص کر علماء نے کی۔ اکتوبر ۱۸۵۸ء تک فرنگیوں سے برسرپیکار رہے بالآخر پکڑے گئے۔ فرنگیوں نے چُونے عریض وطویل اُبلتی بھٹی میں ڈال کر ہلاک کیا۔

نظام علیخاں یہ مجاہد آزادی شاہ جہان پور سے تعلق رکھتے تھے۔ اپریل ۱۸۵۸ء میں شاہ جہان پور میں بیچپوریا گھاٹ کے مقام پر زبردست معرکہ ہوا، اس میں مجاہدین نے فرنگیوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ اس وقت مجاہدین کی کمان آپ ہی کے ہاتھ میں تھی۔ آپ بے جگری سے لڑے اور جام شہادت نوش کیا۔ اس پر آپ کے ساتھیوں میں بھگدڑ مچ گئی اور انہیں ہزیمت اُٹھانا پڑی۔

مولانا غلام حسین آپ نے فرخ آباد میں عوام کو فرنگیوں کے خلاف اُبھارنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ آپ نے پٹیالی کی لڑائی میں حصہ لیا، پکڑے گئے اور پھانسی پائی۔ بھاری بھر کم ہونے کی بنا پر پھانسی کا پھندا آپ کی جدوجہد سے ٹوٹ گیا۔ بعد میں زیادہ مضبوط رسے سے پھانسی دی گئی۔

نواب نور الصمد خاں سرسہ کے نواب تھے۔ نواب گوہر علی خاں کے ساتھ جہاد میں حصّہ لیا اور اُن کی شکست کے بعد اپنے چچا زاد بھائی رستم علی خاں اور چند ملازمین کے ہمراہ نواب مالیرکوٹلہ کے پاس پناہ لینے کے لئے چلے گئے۔ ضلع لدھیانہ کے ایک دیہات میں رات بسر کی، دیہات سکھوں کا تھا۔ رات کو انھوں نے گھیر لیا اور لدھیانہ کے فرنگی فوجی کمانڈر کو اطلاع دے کر گرفتار کروادیا۔ فیروزپور قلعہ میں پھانسی پر لٹکا دئے گئے جب کہ نواب زادہ رستم علی خاں اور چند دوسرے افراد کو حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔

مولانا محمد منیر نانوتوی مدرسہ دیوبند، ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں اہم مجاہدین کی جائے پناہ رہا۔ مولانا محمد منیر کو مولانا مملوک علی، مفتی صدر الدین آزردہ اور مولانا عبد الغنی کا شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ مولانا فرنگیوں کے خلاف بے جگری سے لڑے۔

مولانا عبد الرحیم آپ مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے بھتیجے تھے۔ تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا، پکڑے گئے اور گرفتار ہو کر انڈیمان بھیجے گئے۔ وہاں سے ۱۸۸۳ء میں رہا ہوئے۔ ۲۴ اگست ۱۹۲۳ء کو وفات پائی۔

مفتی عنایت احمد کاکوروی سرکاری ملازم تھے۔ علی گڑھ سے بحیثیت صدر امین تبادلہ ہوا تو بریلی اُٹھ آئے۔ آپ نے ایک انجمن بنام درجلسہ تائید دین متین بریلی میں قائم کی جس کا مقصد مسلمانوں کی مذہبی و معاشرتی اصلاح تھی۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے اصلاحی رسالے جاری کئے۔ آپ کا شمار تحریک آزادی کے نامور مجاہدین میں ہوتا ہے۔

مولانا عالم علی آپ مولانا محمد اسحٰق کے شاگرد تھے۔ تحریک آزادی میں بھرپور حصّہ لیا۔ سرسیّد احمد خاں نے آپ کو پھانسی سے اس دلیل پر بچایا کہ آپ نے کچھ عیسائیوں کو پناہ دی تھی۔[1]

محراب شاہ قلندر آپ مولانا احمد اللہ شاہ کے اُستاد تھے۔ آپ نے ہی انھیں

---

[1] تذکرہ کاملانِ رام پور، احمد علی شوقؔ، ص ۱۸۸ - ۱۸۹

لکھنؤ جانے کی ہدایت کی تھی۔ محراب شاہ قلندر نے مولانا کی تربیت اس انداز سے کی کہ اُن میں جذبۂ جہاد پوری طرح بیدار ہوگیا۔ آپ خود لڑائی میں فعّال نہ تھے۔

مولانا احمد اللہ صادق پوری، مولانا شاہ محمد حسین، مولانا واعظ الحق:۔ ۷ جون ۱۸۵۷ء کو داناپور میں فوج میں بے چینی اور بے اطمینانی پھیلی تو پٹنہ کے کمشنر ولیم ٹیلر نے ان تینوں حضرات کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ ۱۹ جون کو اس نے ان تینوں کو مشورے کی خاطر بلایا اور وہیں ان کو نظر بند کرنے کا حکم دے دیا۔

نواب وزیر علی خاں، نواب امیر علیخاں | یہ دونوں بھائی فتح آباد (علاقہ حصار) کے نواب تھے۔ دونوں نے تحریک آزادی میں حصہ لیا۔ جنرل وین کورٹ لینڈ نے نواب گوہر علیخاں کو شکست دینے کے بعد اپنی پیشقدمی جاری رکھی اور فتح آباد کے قریب دونوں کو شکست دی۔ ان دونوں بھائیوں اور اُن کے دو حقیقی بھتیجوں نوابزادہ صوبیدار علیخاں اور امراؤ علیخاں کو حصار میں جاکر پھانسی دے دی گئی۔

ڈاکٹر سیّد امیر علی، ڈاکٹر رسُول بخش، سیّد کرم علی:۔ ان تینوں مجاہدین کا تعلق پٹنہ سے تھا۔ پہلے دونوں مجاہدین تو باقاعدہ سرکاری ملازم تھے جبکہ مؤخرالذکر مری میں قلعی گر کی حیثیت میں چکر لگاتے رہتے تھے۔ اپنے خلوص، نیکی اور جوشِ حمیت سے آپ نے خاصا بڑا حلقہ پیدا کر لیا۔ جب آپ کی مخالفانہ سرگرمیوں کی اطلاع فرنگیوں کو ملی تو ایڈورڈ تھارنٹن نے گرفتاری کے لئے ایک آدمی بھیجا۔ کرم علی نے اُس کے ہاتھ سے تلوار چھین کر اپنے پیٹ میں مہلک زخم لگا لیا اور کہا تُو تو ہم وطن ہے تجھے کیا ماروں۔ اسی حالت میں گرفتار ہوئے۔ بے تکلفی سے یہ اقرار کیا کہ مجھے فخر ہے کہ میں نے فرنگیوں کے خلاف کام کیا لیکن مقامی لوگوں کی بزدلی نے تدبیر اُلٹ دی۔ ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو پھانسی پر لٹکا دیئے گئے۔ دونوں ڈاکٹر بعد میں گرفتار ہوئے، انہیں ۱۷ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو پھانسی دی گئی۔

مولانا علاؤالدین | حیدرآباد دکن سے تعلق رکھتے تھے۔ سالار جنگ نے علماء کو تاکید کی کہ وہ جہاد کے لئے کوئی فتویٰ جاری نہ کریں۔ مولانا نے اس اقدام کی

مخالفت کی چنانچہ ۱۷ جولائی ۱۸۵۷ء کو شورش پیدا ہوئی جسے دبا دیا گیا۔ مولانا کو گرفتار کر کے کالے پانی بھیج دیا گیا۔

غوث محمد خاں | یہ جھانسی کی رانی لکشمی بائی کے میر آتش تھے۔ بندیل کھنڈ کی ایک ریاست کے جنرل نتھے خاں نے جھانسی پر دھاوا بولا تو آپ نے اُسے ایک یادگار شکست دی۔ رانی جھانسی نے آپ کو اپنی پازیب انعام میں بخشی۔

مولانا مہدی | پٹنہ میں مجسٹریٹ تھے۔ جب گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ان کو محض اس الزام میں پکڑ لیا گیا کہ آپ مجاہدین کی سرگرمیوں کو نظرانداز کر رہے تھے۔

جھنڈا شاہ | یہ ایک فقیر تھے اور جہاد میں فعال تھے اور عوام میں مکرم جانے جاتے تھے۔

مولانا نور الہدیٰ | آپ کو بلگاؤم سے گرفتار کیا گیا تو پتہ چلا کہ تنظیم کا جال بمبئی سے مدارس تک پھیلا ہوا ہے۔

مولانا کرامت علی | آپ ڈھاکہ میں فعال تھے لیکن کوئی خاطر خواہ اثر پیدا نہ کر سکے۔

محمد اسمٰعیل | پونا میں تحریک کے قائد تھے جہاں آپ حیدر آباد سے آئے تھے۔ آپ کو جامع مسجد میں ایک گروہ سے خطاب کرنے پر گرفتار کیا گیا۔

پادشاہ میاں | جگہ جگہ سفر کرتے اور جہاد کی تبلیغ کرتے تھے۔

مولانا احمد میاں نصر اللہ | باروچ میں تحریک کے قائد تھے۔

وزیر علی خاں | بہادر شاہ ظفر نے آپ کو آگرہ کا گورنر مقرر کیا۔

مولانا رحیم اللہ | آپ کو جہاد کے موضوع پر تقریر کرنے سے فرنگیوں نے منع کر دیا۔

کالے خاں رسالدار، محمد حسین تحصیلدار، حکیم صالح محمد | یہ تینوں حضرات بھی انگریزوں کے خلاف سراپا جوش و عمل بنے ہوئے تھے۔



حرفِ آخر

تحریکِ آزادی ۱۸۵۷ء نامرادی، تباہی اور بربادی پر منتج ہوئی۔ فرنگیوں نے اِسے غدر کا نام دیا۔ لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ جس حد تک سامراجیت پر ضرب کاری لگانے اور اس کے مصائب کے خلاف نبرد آزما ہونے کا سوال ہے یہ جدوجہد آزادی تھی۔ بدقسمتی سے اس کا خاتمہ ناکامی کی شکل میں ہوا۔ اس لئے اِسے غدر یا بغاوت کا نام دیا گیا، اگر کامیابی سے ہمکنار ہوتی تو اسے آزادی کی مقدس جنگ کا نام دیا جاتا۔ تحریک نے یا تو کامیاب ہونا ہوتا ہے یا ناکام لیکن اس تحریک میں ہم کسی طور بھی مجاہدین کی نیت پر حرف گیری نہیں کر سکتے۔ انہوں نے اپنے خون سے اس گلستان کو سینچنا چاہا لیکن کئی اسباب کوہِ گراں بن کر اُن کی راہِ منزل میں کھڑے تھے۔

مجاہدین کا خیال تھا کہ جب وہ تلوار اٹھائیں گے تو سارا ملک اُن کے شانہ بشانہ اُٹھ کھڑا ہو گا۔ لیکن جنگی رفیقوں کے سوا عام شہری آبادی نے اس تحریک میں حصہ نہ لیا۔ فرنگیوں کے خلاف عام طبقہ میں کوئی پروپیگنڈا نہ کیا گیا۔ اس میں کلام نہیں کہ بہت سے عوام نے ان کا ساتھ دیا لیکن اس بھیس میں غنڈے بھی شامل ہو گئے جنہوں نے بے اعتدالیوں کا مظاہرہ کر کے تحریک میں بدنظمی پیدا کی۔ ریاستوں نے اس تحریک میں حصہ نہ لیا۔ مختلف سربراہان ریاست وہ حقیر سی رقم بھی دہلی نہ بھیج سکے جس کا بہادر شاہ ظفر کے فرمان میں مطالبہ کیا گیا تھا۔ یہ دہلی اور راجپوتانہ کے گردونواح کی بارہ ریاستیں تھیں اور اُن سے محض بارہ لاکھ پنتالیس ہزار روپیہ مانگا گیا تھا۔ روپے پیسے کی عدم فراہمی نے مجاہدین کی خوراک، یونیفارم اور جدید اسلحہ کی دستیابی میں بڑی رکاوٹ پیدا کی۔ فرنگی فوج کے پاس جدید اسلحہ تھا اور وافر مقدار میں موجود تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی

نے ہندوستان کو کنگال کر رکھا تھا ایسے میں دہلی کا خزانہ خالی پڑا تھا اور ویسے بھی مغل سلطنت کی حدود دہلی تک ہی سمٹ کر رہ گئی تھیں۔

یہ تحریک ایسے خطوط پر منظم نہیں کی گئی تھی جو یورپ میں صنعتی انقلاب برپا ہوتے کے بعد جدید حربی اور سائنسی علوم اور مواصلاتی اور تعلیمی نظاموں سے لیس ہندوستان میں ان مداخلت کاروں کی ٹھوس تنظیم کا مقابلہ کر سکتی۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی کا ہندوستان ملوکیت اور جاگیرداری نظام کے دوہرے جوئے تلے دبا ہوا تھا۔

برصغیر کی برّی اور بحری حدود میں امن تھا اور فرنگیوں کا وہاں مکمل طور پر تسلط تھا، ان علاقوں سے ان کو تازہ دم سپاہی میسر آتے۔ سکھ تو اس طرح مجاہدین کے خلاف برسرپیکار تھے جیسے یہ وطن اُن کا نہ ہو۔ اس طرح فرنگی ذہنوں نے پھوٹ اور اختلاف پیدا کرنے کے لئے خطرناک ریشہ دوانیوں کو جنم دیا جن کی وجہ سے افسوسناک صورت حال پیدا ہوگئی۔ خود مجاہدین میں معمولی معمولی باتوں پر اختلافات نے اتحاد کو کمزور کیا جیسے اودھ میں مولانا احمداللہ شاہ اور نواب ممّو خاں کے درمیان اختلافات موجود تھے اور ایک موقعہ پر دونوں کے حامیوں میں باقاعدہ لڑائی ہوگی۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ برصغیر کی اکیتس چھاؤنیوں میں تحریک اُٹھی مگر حقیقت یہ ہے کہ سوائے میرٹھ چھاؤنی کے کہیں بھی ہندوستانی معقول تعداد میں شریک نہیں تھے۔ لوگ ایک صدی تک کمپنی کی حکومت دیکھ چکے تھے۔ بنگال سب سے پہلے اس کے ماتحت آیا۔ وہاں کسان کچلے جا چکے تھے اور ایک ابھرتے ہوئے درمیانہ طبقہ نے اپنے آپ کو مغربی تعلیم و تہذیب کے سپرد کر دیا تھا۔ جنوبی اور مغربی ہندوستان کے علاوہ مدارس اور بمبئی بھی اسی ڈگر پر چل رہے تھے۔ صرف شمالی ہندوستان میں اطاعت و مصالحت کا رنگ مفقود تھا۔ پنجاب ویسے ہی ۱۸۵۰ء سے فرنگیوں کی اطاعت کا دم بھر رہا تھا۔ محض وسطی یا قریبی ہندوستان کے

علاقوں میں دیکھتی آنکھوں ایک شعلہ جوالا پھوٹ پڑا تھا لیکن ان مراکز میں مطلقاً کسی قسم کی باہم شیرازہ بندی نہیں تھی۔ ذرائع نقل وحمل اور مواصلات پر فرنگیوں کا مکمل قبضہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان مراکز کے درمیان باہمی اتصال موجود نہ تھا۔ اس کے برعکس فرنگیوں کے مراکز محفوظ اور مربُوط تھے۔

۱۸۵۷ء سے قبل ہندوستان میں شخصی حکومتوں کا دَور دَورہ تھا۔ لوگ ان سے تنگ آچکے تھے۔ تحریک کے قائدین نے اُن کے سامنے کوئی واضح پروگرام نہ رکھا جس سے اُن کو یہ اندازہ ہو سکتا کہ وہ فرنگیوں سے آزادی حاصل کرنے کے بعد کونسا نظام قائم کریں گے۔ دوسری طرف فرنگی سرکار نے سادہ لوح عوام سے ایسے خوشنما وعدے کئے کہ وُہ ایسا نظام قائم کریں گے جس میں اُن کے مُلکی اور مذہبی مفادات کی بھرپُور حفاظت کی جائے گی۔ کئی وطن دشمن ہندوستانیوں نے، جو بااثر تھے لیکن اپنی اغراض کے بندے تھے، فرنگیوں کی انہی حکمت عملیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ بیشمار ایسے بھی تھے جو اُن کے ساتھ در پردہ ساز باز کر چکے تھے اور حریت پسندوں کے حوصلے پست کرنے میں پیش پیش تھے۔ اگر اپنے غدّاری نہ کرتے تو حُریت پسندوں کو اس طرح ناکامی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ مزید براں دُول خارجہ کے سامنے حُریّت پسندوں کی مظلومیت اور تحریک کے حقیقی مقاصد کا خاکہ موجود نہیں تھا بلکہ فرنگیوں نے اُن کے خلاف اتنا زہر آلود پروپیگنڈا کیا کہ اُلٹا اُن پر غدر برپا کرنے کا الزام لگا۔ دہلی اور لکھنؤ تحریک کے دو اہم مراکز تھے۔ دہلی کی تسخیر کے بعد وہاں لُوٹ کھسُوٹ کے عمل سے اُن لوگوں کو بھی فرنگیوں کی اعانت کی تحریک ملی جو گھروں میں رہ گئے تھے، وُہ بھی اُن کی مدد کو دوڑ پڑے۔

دہلی میں یہ تحریک ۱۱ مئی کو شروع ہو کر ۱۸ ستمبر کو ختم ہوگئی۔ فوج کو تین روز تک شہر کو لُوٹنے کی اجازت دی گئی۔ فوجی آوارہ کتّوں کی طرح ایک مکان کے بعد دوسرے مکان میں داخل ہوتے۔ وہ دیواروں کو ٹھوک بجا کر دیکھتے اور فرش پر پانی بہا کر نشیب کا اندازہ لگاتے کہ وہاں مکینوں نے گڑھا کھود کر کچھ نہ کچھ بچا

کر رکھا ہوگا۔ قیمتی ساز و سامان کے ساتھ ساتھ چھتوں کی کڑیاں، تختے اور کواڑ تک نہ چھوڑے گئے۔ فرنگی چاہتے تھے کہ دہلی بھر میں ہل پھروا کر اسے شور زار بنا دیا جائے لیکن کسی طرح اتفاق نہ ہو سکا۔ شہر کے تقریباً ایک لاکھ مکان مسمار کر دیئے گئے۔ چند ممتاز عمارتوں کے نام ملاحظہ ہوں جو مسمار کی گئیں۔

۱:۔ چوک سعد اللہ خاں

۲:۔ اُردو بازار

۳:۔ خانم بازار

۴:۔ خاص بازار

۵:۔ فیض بازار

۶:۔ کوچۂ بلاقی بیگم

۷:۔ حویلی خانِ دوراں

۸:۔ گلوں کا بازار

۹:۔ دریا گنج کی گھاٹی۔

۱۰:۔ انگوری باغ

۱۱:۔ جامع مسجد سے دروازہ راج گھاٹ تک کی تمام عمارتیں۔

۱۲:۔ کلکتہ دروازہ سے کابلی دروازہ تک کے سب محلّے

۱۳:۔ جامع مسجد سے متصل شاہی درسگاہ جہاں آخری دور میں مُفتی صدرالدین آزردہ درس دیتے تھے۔

لال قلعہ میں درج ذیل عمارات منہدم کی گئیں،

۱:۔ اُمراء اور شہزادوں کے تمام محلّات

۲:۔ دیوانِ عام کے ہال کے سوا باقی سب کچھ مسمار کر دیا گیا۔

۳:۔ موتی محل توڑ کر توپ خانہ بنا دیا گیا۔

۴:۔ باغ حیات بخش اُجاڑ دیا گیا۔

۱۵۔ مہتاب باغ ویران کر دیا گیا۔

۱۶۔ نور و جہاں مٹا دیا گیا۔

۱۷۔ دیوان عام کا شمالی مطبخ

۱۸۔ دیوان عام اور دیوان خاص کے درمیانی حصے۔

۱۹۔ اکبر آبادی مسجد جسے شاہ جہان کی بیگم اعزاز النساء نے تعمیر کرایا تھا۔

۱۱۰۔ اورنگ آبادی مسجد

جامع مسجد کو سکھوں کی آماجگاہ بنادیا گیا، پہلے اسے گرجا میں تبدیل کرنے کا پروگرام تھا۔ سکھ محرابوں میں بول و براز کرتے، سؤر کاٹتے اور وہیں پکاتے تھے۔ وہ یہاں گھوڑے بھی باندھتے۔ نومبر ۱۸۶۲ء میں مسجد مسلمانوں کو واگزار کی گئی۔ بارہ شقی معاہدے کی ایک شق یہ تھی کہ "انگریز افسروں کو اندر داخل ہوتے وقت جوتے اتارنے کی ممانعت نہ ہوگی۔ البتہ اُن سے یہ اُمید کی جاسکتی ہے کہ وہ کتے ساتھ نہ لائیں اور سگریٹ وغیرہ نہ پئیں گے۔"

مسجد فتح پوری کی تمام دوکانیں ضبط کرلی گئیں جو لالہ چھنامل نے ۲۹ ہزار روپے میں خریدیں۔ ایک مدت کے بعد مسلمانوں نے یہ دوکانیں ایک لاکھ دس ہزار روپے دے کر واپس حاصل کیں۔

اب مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا۔ ستائیس ہزار اہل اسلام نے پھانسی پائی۔ سات روز برابر قتل عام ہوتا رہا[1] یہ سزائیں مختلف طریقوں سے دی گئیں۔ جب فرنگیوں کو یہ علم ہوا کہ مسلمان اس قسم کی موت (پھانسی) کو خاطر میں نہیں لاتے تو ان میں سے چار آدمیوں کو فوجی عدالت کے حکم سے توپ سے اڑا دیا گیا.... ایک توپ میں اتفاق سے بارود زیادہ بھری ہوئی تھی۔ اس کے داغے جانے سے بدقسمت ملزم کا گوشت ریزہ ریزہ ہوکر فضائے

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۴۵۴

آسمان میں اڑا اور تماشائیوں پر خون کے چھینٹے اور گوشت کے ٹکڑے گرے۔ اور اس کا سر ایک راہرو پر اس زور سے گرا کہ اُسے بھی چوٹ آئی"۔[1]

حریت پسندوں کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر سزائیں دی گئیں۔ بعض کے سر قلم کرکے بانسوں پر آویزاں کئے گئے، بعض کی لاشیں زنجیروں میں جکڑی گئیں اور سرِ عام اُن کی تشہیر کی گئی۔ کئی ایک کو نہائیت بے دردی سے کوڑے مارے گئے کہ وہ جان بحق ہو گئے۔ کوڑے دو سو سے لے کر ایک ہزار تک کی تعداد میں لگائے جاتے تھے۔ سر ہنری کاٹن نے اپنی کتاب میں مولبری تھامسن کے حوالے سے لکھا ہے کہ "یہ خیال کرتے ہوئے کہ کہیں قیدیوں کے ساتھ زیادتی نہ کی گئی ہو، میں فوراً لیک کران کے خیمے میں گیا۔ جہاں میں نے ان بدبخت مسلمانوں کو عالمِ نزع میں دیکھا۔ یعنی مُشکیں باندھ کر برہنہ اُن کو زمین پر لٹایا ہوا تھا اور سر سے لے کر پاؤں تک تمام جسم کو گرم تانبے سے داغ دیا تھا۔ اس رُوح فرسا نظارہ کو دیکھ کر میں نے اپنے پستول سے اُن کا خاتمہ کر دینا ہی ان کے حق میں سمجھا۔" ایک بُرج میں سینکڑوں کی تعداد میں مجاہدین کو بند کر دیا گیا جہاں سے ایک ایک کو باہر لا کر گولی ماری جاتی۔ جب ڈیڑھ سو کے قریب مجاہدین کو گولی سے اڑا دیا گیا تو قاتلین میں سے ایک شخص بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ یہ ایک بوڑھا سپاہی تھا، اسے ستانے کے لئے تھوڑی سی مہلت دی گئی دوبارہ کاروائی کا آغاز کیا گیا تو جب تعداد دو سو سنتیس (۲۳۷) تک پہنچ گئی تو اطلاع ملی کہ مجاہدین بُرج سے باہر نہیں آ رہے جہاں اُنہیں چند گھنٹے قبل بند کیا گیا تھا۔ بُرج کے دروازے کھولے گئے تو تقریباً پنتالیس مجاہدین گرمی اور حبس کی وجہ سے دم توڑ چکے تھے۔ ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر ڈی لین نے اپنے ایک آرٹیکل میں لکھا۔

"زندہ مسلمانوں کو سُور کی کھال میں سینا یا پھانسی سے پہلے ان کے جسم پر سُور کی چربی ملنا یا زندہ آگ میں جلانا یا ہندوستانیوں کو مجبور کرنا تاکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کریں، ایسی مکروہ اور منتقمانہ حرکات ہیں جن کی دُنیا کی کوئی تہذیب بھی اجازت نہیں دیتی"۔

---

[1] A LADY'S ESCAPE FROM GAWALIAR, P.233.

فرنگی ان مظالم پر بھی اپنا انتقام پورا نہ کر سکے۔ مصنف کیٹی نے اپنی کتاب میں ایک انگریز ناول نویس نکلسن کے اس خط کا اقتباس نقل کیا ہے جو اس نے اپنے دوست ایڈورڈ کو لکھا: "دہلی میں انگریز عورتوں اور بچوں کے قاتلین کے خلاف ہمیں ایک ایسا قانون پاس کرنا چاہیئے جس کی رُو سے ہم ان کو زندہ جلا سکیں یا زندہ ان کی کھال اتار سکیں۔ ایسے ظالموں کو محض پھانسی کی سزا سے ہلاک کر دینے کا خیال ہی مجھے دیوانہ کئے دیتا ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ کاش میں دنیا کے کسی ایسے گمنام گوشے میں چلا جاؤں جہاں مجھے یہ حق حاصل ہو کہ میں حسبِ ضرورت سنگین انتقام لے کر دل کی بھڑاس نکال سکوں"

لارڈ رابرٹس کے نزدیک اس "کام" کا مقصد یہ تھا کہ "ان بدمعاش مسلمانوں کو بتا دیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان پر حکومت کریں گے"[۱]
فرنگی مسلمانوں کے درپے آزاد تو تھے ہی، تحریکِ آزادی کے بعد ان کی املاک ضبط کر لی گئیں۔ بیشمار افراد کو محض اس جرم میں پھانسی دی گئی کہ فرنگی فوج کے مارچ کے وقت ان کے چہرے دوسری طرف کیوں تھے؟ جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے۔ ان پھانسی پانے والوں اور ظلم کا نشانہ بننے والوں میں عوام الناس کے ساتھ اہلِ علم وفضل بھی تھے، سردار و رئیس بھی تھے، شہزادے اور جاگیردار بھی تھے۔ دلی اور اس کے نواح میں جتنے شہزادے پکڑے گئے سب پھانسی پر لٹکا دیئے گئے[۲] بہادر شاہ ظفر کے تین بیٹوں کو پہلے برہنہ کیا گیا، پھر برسرِ عام فرنگی فوج کے افسروں نے انہیں گولی کا نشانہ بنایا۔ ان کی لاشیں کوتوالی کے سامنے لٹکوا دی گئیں۔ جہاں ان کی بوٹیاں گدھ اور کتے کئی دن تک نوچتے رہے۔[۳] خواتین کی عصمت دری

---

۱ LETTERS WRITTEN DURING INDIAN MUTINY, 31ST DEC. 1857

۲ تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ، مولانا ذکاء اللہ، ص ۷۰۸

۳ قیصر التواریخ، جلد دوم، ص ۵۳۴

کی گئی، ہزاروں اس خوف سے کنوؤں میں کود گئیں۔ دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد چند ماہ کے اندر ہندوؤں کو دہلی واپس آنے کی اجازت دے دی گئی لیکن مسلم آبادی کو ۱۸۵۹ء تک واپس آنے کی اجازت نہ ملی۔[1]

ان جانگداز حالات پر غالب نے خوف و احتیاط کے باوجود اس طرح اشکباری کی ہے:-

بسکہ فعال ما یرید ہے آج !! ہر سلحشور انگلستان کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا ہے آبِ السان کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا
شہر دلّی کا ذرہ ذرہ خاک تشنۂ خون ہے ہر مسلمان کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک آدمی واں نہ جا سکے یاں کا

۶۔ اگست ۱۸۵۷ء کو ہزارہ میں رجمنٹ ۵۵ کے اکتالیس سپاہیوں کو قلعہ مان سرائے میں توپ سے اڑا دیا گیا۔ جب وحشیانہ انتقام کی حد ہو گئی تو نہ صرف لارڈ کیننگ بلکہ جان لارنس نے بھی اس کے خلاف احتجاج کیا بلکہ برطانوی وزیراعظم ڈسرائیلی نے اعلان کیا کہ "میری قوم کے مذہبی اعتقادات یکسر بدل گئے ہیں۔ وہ جناب مسیحؑ کی تعلیمات سے منحرف ہو رہی ہے اور اس کی جگہ اس نے پرانے یونانی دیوتا مولوک (MOLOCK) کی پوجا شروع کر دی ہے۔" لارڈ کیننگ نے ملکہ وکٹوریہ کو لکھا: "ہماری قوم کے دماغ میں ایک عالمگیر دیوانگی اور انتقام کا جذبہ موجزن ہے۔ ہر دس آدمیوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو چالیس یا پچاس ہزار انسانوں کے بے دریغ قتل کو ضروری یا صحیح نہ سمجھتا ہو۔"

فرنگیوں کے مظالم کا نشانہ مسلمان بنے کیونکہ یہ وہی تھے جو اورنگ زیب عالمگیرؒ سے

---

[1] SIR SYED AHMED KHAN (A POLITICAL BIOGRAPHY)
SHAN MUHAMMED, P.32

لے کر سلطان فتح علی ٹیپو تک سعئ پیہم کرتے رہے تھے کہ ان بدیسیوں کو برصغیر سے نکال باہر کریں۔ تحریک آزادی میں بھی وہ پیش پیش تھے۔ فرنگی مسلمانوں کو اپنی راہ میں ایک عظیم سدِراہ خیال کرتے تھے۔ "مسلم آبادی والے اضلاع میں عیسائی مشنری پیش رفت نہ کر سکتے تھے۔ ہماری مذہبی اور تعلیمی تحریکات کو مولوی اور مذہبی جنون بڑے شک سے دیکھتے ہیں ... محمد (صلعم) کے پیروکاروں کے ساتھ ہماری مخالفت شیوا اور وشنو کے عبادت گزاروں اور ہمارے درمیان کی نسبت کہیں بہت زیادہ ہے۔ بلاشبہ وہ ہمارے راج کے لئے زیادہ خطرناک ہیں۔"[۱]

تحریک آزادی کے بعد برصغیر براہ راست تاج برطانیہ کے ماتحت آگیا۔ ذیل کے بیانات آئندہ کے لئے اصول حکمرانی قرار پائے۔ گورنر جنرل لارڈ ایلنبرا نے کہا!

"میں اس عقیدے کی طرف سے آنکھ نہیں بند کر سکتا کہ یہ قوم (مسلمان) بنیادی طور پر ہماری مخالف ہے، اس لئے ہماری صحیح پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کو اپنا طرفدار بنائیں۔"[۲] ہنٹر نے یوں لکھا:

"مسلمانانِ ہندوستان، اب اور اس سے بہت عرصے پہلے بھی ہندوستان کی انگریزی حکومت کے لئے ایک مستقل خطرہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی نہ کسی وجہ سے وہ ہمارے طور طریقوں سے بالکل الگ تھلگ ہیں اور ان تمام تبدیلیوں میں جن میں زمانہ ساز ہندو بڑی خوشی سے حصہ لے رہے ہیں، اپنے لئے بہت بڑی قومی بے عزتی تصور کرتے ہیں۔"[۳]

مسلمانوں کی معاشی بوسیدگی اور سیاسی انحطاط کے بارے میں اس دور کا ایک فارسی اخبار اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتا ہے: "آہستہ آہستہ مسلمانوں سے ہر قسم کی ملازمت خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، چھینی جا رہی ہے اور دوسری قوموں کو دی جا رہی ہے، لیکن وقت

۱؎ MY INDIAN MUTINY DIARY, P.179

۲؎ حالی کا سیاسی شعور ص ۳۰ بحوالہ ہندی اردو تنازعہ ص ۸

۳؎ ہمارے ہندستانی مسلمان ص ۱۹

ایسا آگیا ہے کہ وہ اپنے گزٹ میں اس بات کا خاص طور پر اعلان کرتی ہے کہ مسلمانوں کو سرکاری نوکری نہیں دی جائے گی۔ ابھی ابھی سندربن کے دفتر میں چند آسامیاں خالی ہوئی تھیں۔ اس افسر نے سرکاری گزٹ میں اشتہار دیتے ہوئے صاف صاف لکھ دیا تھا کہ یہ ملازمتیں سوائے ہندوؤں کے اور کسی کو نہیں ملیں گی۔"[1] انتقامی کاروائی محض سیاسی اور معاشی سطح تک ہی محدود نہ رہی بلکہ لسانی سطح پر بھی ایسے اقدامات کئے گئے جن سے مسلمانوں کو نقصان پہنچا۔

انگریزوں نے فورٹ ولیم کالج میں ایک نئی زبان ہندی کو جنم دیا اور ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے سنسکرت کی تعلیم و تحقیق کی آڑ میں ہندوستان اور ہندوؤں کی لسانی وعلمی برتری کا سکہ جمایا۔ پہلے فارسی کو ختم کیا گیا پھر اردو کو ہٹا کر انگریزی کو ہر سطح پر ذریعہ تعلیم و تدریس بنا دیا گیا۔ سرکاری دفتروں اور عدالتوں کی کاروائی فارسی اور اردو کے بجائے انگریزی میں ہونے لگیں تو انگریزی تعلیم کی کمی اور حکومت کی بے اعتنائی کے سبب، معاش کے دروازے مسلمانوں پر ایک ایک کرکے بند ہونے لگے۔ چھ برس پہلے تک جو لوگ ہندوستان کے حاکم اور سب سے مقتدر طبقے میں شمار ہوتے تھے وہ دیکھتے ہی دیکھتے حقیر و بے وقعت ہو گئے۔[2]

یہاں یہ ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ تحریکِ آزادی برصغیر کے ایک بہت بڑے علاقے میں پھیلی لیکن اس کے اصل منتظمین کے نام کبھی بھی منظرِ شہود پر نہ آئے فرنگیوں کے جاسوسوں اور اطلاعات فراہم کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور کئی ایک مقامات پر انقلابیوں کو محض اس لئے شکست ہوئی یا اُن کو بھاری نقصانات اٹھانا پڑے کیونکہ اُن کے منصوبوں کا علم فرنگیوں کو ہو گیا۔ پھر بھی وہ تحریک کا منصوبہ

---

[1] دُوربین (کلکتہ)، بابت ۱۴ جولائی ۱۸۶۹ء، بحوالہ انڈین مسلمین، رام گوپال ص ۲۰۰، نیز ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۲۵۳

[2] ہندی اردو تنازعہ ص ۸۱

بنانے والوں کو نہ پکڑ سکے۔ عوام اور خواص میں سے کئی ایک کو فرنگیوں نے زندہ پکڑا اور لیکن کسی نے بھی یہ راز افشا نہ کیا کہ تحریک کی منصوبہ بندی کس جگہ ہوئی تھی۔ ایسی پردہ داری کو قائم کرنا ایک مشکل امر ہے۔ جب تحریک کا دائرہ وسیع ہوا اور ایسے افراد کو اطلاعات یا ہدایات ارسال کرنی پڑتیں جنہیں پہلے اعتماد میں نہ لیا جا سکا۔ کوڈ اور خفیہ تحریر سے کام نہ چل سکا۔ تواہم پیغامات بھیجنے کے لئے انوکھے طریقے اختیار کئے گئے۔ چونکہ تمام ایلچی مکمل طور پر تربیت یافتہ نہ تھے اس لئے کچھ فرنگیوں کے ہتھے چڑھ گئے لیکن ان سے اُس پیغام، جو اُن کے پاس ہوتا تھا، کے سوا کچھ بھی حاصل نہ کیا جا سکا۔ ممکنہ وضاحت صرف یہی ہے کہ منصوبہ وسیع خطوط پر تیار کیا گیا اور ایک دفعہ جب اس کے مقاصد اور طریقوں کی حمایت حاصل ہو گئی تو اس کی حقیقی تعمیل کی ذمہ داری مقامی قائدین پر چھوڑ دی گئی۔ اس کے سوا کوئی دوسرا طریقہ ممکن ہی نہ تھا۔ انقلاب کے قائدین کا ٹیلی گراف اور ڈاک وغیرہ پر کوئی کنٹرول نہ تھا لہٰذا مقامی حالات کے فروغ کی کبھی بھی ہیڈ کوارٹر میں اطلاع نہ ہو سکتی تھی چاہے ایسی کوئی ایجنسی قائم ہی کیوں نہ ہو جاتی۔ اور یہی بات اُن ہدایات پر بھی صادق آتی ہے جو اغلب ہے کسی مرکزی اتھارٹی کو بھیجی گئیں۔ تاہم یہ ہمیشہ سربستہ راز ہی رہے گا کہ منصوبہ کیسے معرض وجود میں آیا اور اس کے شروع کرنیوالے کون تھے۔ صرف ایک ہی واضح حقیقت ہے کہ اس سازش کی تشکیل میں، اس کے لئے حمایت کے حصول میں اور حقیقی لڑائی میں علماء نے نہایت اہم اور جاں نثار کا کردار ادا کیا۔[1]

فرنگیوں پر یہ حقیقت عیاں تھی کہ جب تک مسلمانوں میں دین کے ساتھ لگاؤ و شغف کی رمق بھی موجود ہے، وہ اُن کے لئے وبال جان بنے رہیں گے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایک طرف علماء کرام کو ختم کرنے کی کوشش کی جس سے

---

[1] ULEMA IN POLITICS, P.187–188

اسلامی درس گاہوں کو بہت زیادہ دھچکا لگا۔ بیشتر علماء کرام تہ تیغ کر دیئے گئے اور بقیۃ السیف حجاز مقدس ہجرت کر گئے۔ دوسری طرف انہوں نے مسلمانوں کی صفوں میں رخنہ پیدا کرنے کے لئے فروعی مسائل کو ہوا دی۔ قادیانیت بھی انہی کے ذہن کی پیداوار ہے۔ عیسائی مشنریوں کے کام کو تحفظ دیا گیا۔ اس طرح اُن کے حوصلے اِتنے بڑھ گئے کہ وُہ گلیوں اور بازاروں میں اسلام اور رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک پر رکیک حملے کرنے لگے۔ مولانا قاسم نانوتوی نے قیام دہلی کے دوران میں جب یہ صورت حال دیکھی تو اپنے شاگردوں کو حکم دیا کہ وُہ بھی اسی طرح گلیوں اور بازاروں میں وعظ کا سلسلہ شروع کریں اور مشنریوں کا رد کریں۔ ایک روز آپ خود بھی ایک مجمع میں پہنچے اور پادری تارا چند نے مناظرہ کر کے اُسے سب کی موجودگی میں رسوا کیا۔

فرنگیوں نے کوشش کی کہ جس حد تک اسلام کو نقصان پہنچا سکیں، پہنچائیں۔ مشہور صحافی رسل۔ جس نے تحریک کے دوران میں لندن کے اخبار دی ٹائمز کے لئے رپورٹنگ کی، لکھتا ہے "اگر ہم محمد (صلعم) کے معابد کو بزور طاقت نیست و نابود اور اُن کی روایات کا استیصال کر سکتے تو یہ یقیناً مسیحی مذہب اور برطانوی راج کے لئے اچھا ہوتا"۔[1]

آگے چل کر یہی مصنف رقمطراز ہے: "لیکن ایسی کوشش انسان نہیں کر سکتا اور اس مقصد کو کامیاب بنانے کی کوئی بھی کوشش مشکلات میں صرف اضافہ ہی کرے گی۔ جو ہمارے مذہب اور ہماری حکومت کی ترقی کی راہ میں ہمیشہ ہی کافی حد تک بھری ہوئی ہیں"۔[2]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحریکِ آزادی کے کچلے جانے کے باوجود فرنگی

---

[1] MY INDIAN MUTINY DIARY, P.179-80

[2] ایضاً

اسلام کی قوت سے کس درجہ خائف تھے۔

تحریکِ آزادی جن مقاصد کے لیے شروع کی گئی تھی وہ اگرچہ حاصل نہ ہو سکے لیکن یہ بات مسلّمہ ہے کہ بظاہر فرنگی راج نے استحکام پکڑی لیکن اس تحریک نے اس کے زوال کی بنیاد رکھ دی تھی۔ شہدا کا خون کبھی رائیگاں نہیں جاتا، یہ قدرت کی مصلحتیں ہوتی ہیں کہ بسا اوقات ثمرات فوری طور پر حاصل نہیں ہوتے۔ یہ مسلمانوں کا ہی زبردست جوش و خروش تھا جس نے فرنگیوں کو مکمل مذہبی غیر جانبداری کی ضرورت محسوس کرنے کے علاوہ یہ بھی باور کرایا کہ وہ عوام کے مذہبی احساسات کو مجروح نہیں کریں گے۔ یہ کوئی معمولی کامیابی نہیں تھی، اگرچہ اس نے محکومیت کی سختی یا تذلیل میں تخفیف نہ کی، لیکن اس سے مسلمانوں کے نہایت ہی حساس مقام کو مجروح کرنا یقیناً ختم ہو گیا۔ علی گڑھ کی تحریک ۱۸۵۷ء کے بعد ہی ممکن ہو سکی۔ بغاوت کے کشت و خون سے قبل انگریز اس کی ضرورت محسوس ہی نہ کر سکتے تھے[1]۔

تحریکِ آزادی نے بہتوں کی آنکھیں کھول دیں۔ خوابِ غفلت کو زندگی سمجھنے والوں کی حمیت و غیرت کو حالی کی نظموں اور سرسید کی تقریروں نے بیدار کرنے کی کوشش کی۔ پستی سے نکلنے کا جب احساس پیدا ہوا تو اصلاح کی بھی عالمگیر کوششیں ہوئیں۔ علی گڑھ کالج، ایجوکیشنل کانفرس، دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء اور انجمن حمایت اسلام کا قیام اسی زمانے میں ہوا۔ مسلمانوں کے سامنے دو فرنٹ تھے: فرنگی اور مغربی تعلیم یافتہ ہندو جو مسلمانوں سے صدیوں کی محکومیت کا بدلہ لینے پر تُلے ہوئے تھے۔

فرنگی حکومت نے تحریکِ آزادی سے کوئی سبق نہ لیا بلکہ بے اعتنائی سے نفرت میں اضافہ کیا جس سے مسلمانوں اور فرنگیوں کے درمیان کسی قسم کی بھی مفاہمت

---

[1] ULEMA IN POLITICS, P. 375.

کا امکان ختم ہوگیا۔ اُن کی حکومت خالصتاً ایک سامراجی حکومت ہے۔ حکمرانوں اور محکوموں کے درمیان خلیج وسیع ہوتی چلی گئی۔ ۱۸۷۷ء میں سر ایرسکائن پیری نے THE NINETEENTH CENTURY. میں لکھا:

" ہمارے راج میں بڑی ناگواریاں ہیں۔ طریق کار میں کھُردرپن اور دُرشتی ہے جو مقامی رائے کے لئے ناگوار ہے۔ انصاف کرنے کی ہماری کوشش میں پیدا ہونے والے واضح نقائص ہیں۔ قانون سازی میں ہمارے مسلسل اور ناقابلِ فہم تجربات پر بہت زیادہ ہیجان ہے۔ تازہ بار میں حقیقی خطرہ پایا جاتا ہے جو ہم بظاہر مستحسن اصلاحات کی تعمیل کی اپنی خواہش میں لوگوں پر ڈال رہے ہیں۔"[1]

فرنگیوں نے اہلِ ہند کے اندر پیدا ہونے والی قومیت کے جذبات کے پیشِ نظر ۱۹۳۵ء میں کھوکھلی جمہوری طریقے رائج کئے جو قانون حکومت ہند کی شکل میں سامنے آئے۔ برصغیر کے مسلمانوں نے ان کوششوں کو اپنے لئے ایک اور سامراجیت سمجھا جو مغربی تعلیم یافتہ ہندوؤں کی طرف سے ہو رہی تھیں کہ وہ اور مسلمان ایک ہی گاڑی کے اٹوٹ پہیے ہیں۔ انہوں نے اپنی منزل پاکستان کی صورت میں متعین کر لی تھی جس کا مفہوم لا الٰہ الّا اللہ بتایا گیا۔ مسلمانوں نے اپنی پناہ گاہ حاصل کی جس کی فصیلیں اسلام کی ہیں اور جس کے حصول کے لئے انہیں ۱۸۵۷ء کے برعکس تلوار نہ اٹھانا پڑی بلکہ دستوری مراحل طے کرنا پڑے۔

---

[1] WITH REFERENCE TO AN ESSAY ON THE MUTINY AND ITS CONSEQUENCES BY MICHEAL EDWARDES PRESENTED IN "MY INDIAN MUTINY DIARY", P.XXIII, XXIV.

کتابیات

۱:- فتاویٰ عزیزیہ	شاہ عبدالعزیزؒ	دہلی
۲:- تاریخ عروج عہد انگلشیہ	مولانا ذکاء اللہ	دہلی ۱۹۰۴ء
۳:- مسلمانوں کا شاندار مستقبل	مولانا طفیل احمد منگلوری	دہلی ۱۹۴۵ء
۴:- تواریخ احمدی	فتح محمد طیب	لکھنؤ
۵:- ۱۸۵۷ء کے مجاہد	مولانا غلام رسول مہر	لاہور
۶:- قیصر التواریخ	کمال الدین حیدر	لکھنؤ ۱۹۰۷ء
۷:- دہلی کی جان کنی	خواجہ حسن نظامی	دہلی ۱۹۲۲ء
۸:- تاریخ اودھ	نجم الغنی خاں	لکھنؤ ۱۹۱۹ء
۹:- اخبار الصنادید	نجم الغنی خاں	لکھنؤ
۱۰:- داستان غدر	ظہیر دہلوی	لاہور ۱۹۵۵ء
۱۱:- حیات حافظ رحمت خاں	الطاف علی بریلوی	بدایوں ۱۹۳۳ء
۱۲:- سن ستاون	پنڈت سندر لال	علی گڑھ ۱۹۵۷ء
۱۳:- سرکشی بجنور	سرسید احمد خاں	کراچی ۱۹۵۶ء
۱۴:- ہمارے ہندوستانی مسلمان	ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر (ترجمہ صادق حسین)	لاہور ۱۹۵۵ء
۱۵:- موج کوثر	شیخ محمد اکرم	لاہور ۱۹۶۳ء
۱۶:- علماء کا شاندار ماضی	سید محمد میاں	دہلی ۱۹۶۳ء
۱۷:- مولانا عبیداللہ سندھی	محمد سرور	لاہور ۱۹۶۷ء
۱۸:- مرحوم دہلی کالج	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	دہلی ۱۹۴۵ء

۱۹۔ ہندی اُردو تنازع	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	اسلام آباد ۱۹۷۷ء
۲۰۔ ۱۸۵۷ء پاک وہند کی پہلی جنگِ آزادی	مولانا غلام رسول مہر	لاہور ۱۹۷۱ء
۲۱۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دُوسرا رُخ	ایڈورڈ طامسن ترجمہ: شیخ حسام الدین	لاہور ۱۹۷۴ء
۲۲۔ ۱۸۵۷ء پہلی جنگِ آزادی واقعات و حقائق	میاں محمد شفیع	لاہور ۱۹۵۷ء
۲۳۔ ہماری آزادی کی کہانی: ۱۸۵۷ء کا سیاسی جائزہ	عشرت رحمانی	لاہور ۱۹۵۸ء
۲۴۔ بہادر شاہ ظفر اور اُن کا عہد	رئیس احمد جعفری	لاہور
۲۵۔ پری خانہ	واجد علی شاہ	کراچی ۱۹۵۸ء
۲۶۔ واجد علی شاہ اور اُن کا عہد	رئیس احمد جعفری	لاہور ۱۹۶۷ء
۲۷۔ حیات جاوید	الطاف حسین حالی	لاہور ۱۹۶۶ء
۲۸۔ ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء	امداد صابری	دہلی ۱۹۵۹ء
۲۹۔ سن اٹھارہ سو ستاون کا تاریخی روزنامچہ	خلیق احمد نظامی	دہلی ۱۹۵۹ء
۳۰۔ سرگزشت ایام غدر	عنایت حسین	لکھنؤ ۱۹۳۶ء
۳۱۔ بیگمات کے آنسو	خواجہ حسن نظامی	دہلی ۱۹۲۴ء
۳۲۔ تذکرہ علمائے ہند	مولانا رحمان علی	لکھنؤ ۱۹۱۴ء
۳۳۔ روختۃ الادباء	مولوی محمد الدین	لاہور ۱۹۰۹ء
۳۴۔ اٹھارہ سو ستاون۔ اخبار اور دستاویزیں	عتیق صدیقی	دہلی ۱۹۶۶ء
۳۵۔ تذکرہ کاملانِ رام پور	احمد علی شوق	دہلی ۱۹۲۹ء



ہماری چند مطبوعات

قرآنِ حکیم اور ہماری زندگی ــــ محمد احسان الحق سلیمانی
خدا موجود ہے ــــ عبدالحمید صدیقی
صحائف ــــ قمر نقوی
تاریخ عرب ــــ سید سلیمان ندوی
دنیائے اسلام ــــ سید ہاشمی فرید آبادی
سیرۃ ابن ہشامؒ ــــ علامہ ابن ہشام
سیرۃ النبیؐ ــــ احسان بی اے
رسولِ عربیؐ ــــ عمر ابو النصر
معلم اخلاقؐ ــــ عشرت رحمانی
رسولؐ میدانِ جنگ میں ــــ سید واجد رضوی
تمدنِ عرب ــــ سید علی بلگرامی
تمدنِ ہند ــــ سید علی بلگرامی
عبرت نامہ اندلس ــــ مولوی عنایت اللہ دہلوی
صوفیائے نقشبند ــــ سید امین الدین
خلافت اندلس ــــ نواب ذوالقدر جنگ بہادر
حیات جوہر ــــ عشرت رحمانی
نزہۃ الخواطر ــــ علامہ سید عبدالحیٔ
مسلمان یورپ میں ــــ محمد احسان الحق سلیمانی
پاکستان کا اسلامی پس منظر ــــ آغا اشرف
قائد اعظم اور ان کا عہد ــــ رئیس احمد جعفری
تاریخ سیاست ملی ــــ عشرت رحمانی
مرقع قائد اعظم ــــ آغا اشرف
حیات جوہر ــــ عشرت رحمانی
خطبات قائد اعظم ــــ رئیس احمد جعفری
روداد پاکستان ــــ آغا اشرف
خون کی ہولی ــــ رئیس احمد جعفری
آزادی ہند ــــ رئیس احمد جعفری

مقبول اکیڈمی، لاہور

قائداعظم اور انکا عہد
رئیس احمد جعفری

خطبات قائداعظم
رئیس احمد جعفری

مرقع قائداعظم
آغا اشرف

پاکستان کا اسلامی پس منظر
آغا اشرف

روداد پاکستان
آغا اشرف

خون کی ہولی
رئیس احمد جعفری

رن کچھ سے چونڈہ تک
خالد محمود

پاکستان کا سٹالن گراڈ
محمد سعید

